اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیل ادب

جنوری 2017

مدیر : رانا عبدالرزاق خان
07886304637 & 02089449385
rana_razzaq@hotmail.com

عقیدت سے بہت جشن نبی تم نے منا ڈالا
چراغاں کیلیئے اللہ کا گھر تک جلا ڈالا
(عرشی ملک)

مقتلوں کے منہ کھلے ہیں شہر کے ہر موڑ پر
شکمِ مقتل بھر رہے ہیں دینِ ملاں کے امام
(آدم چغتائی)

www.qindeel-e-adub.com

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

بانی رُکن: خان بشیر احمد رفیق مرحوم مدیر: رانا عبدالرزاق خاں معاون مدیر: سید حسن خان

مدیر خصوصی: سہیل لون مینجنگ ڈائریکٹر: عاصی صحرائی فوٹوگرافی: قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر آڈیو وڈیو: محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ طارق مرزا، محمد اسحٰق عاجز

فہرست

آپ کے خطوط (ادارہ)		2
غزلیات::	احمد منیب، فیض احمد فیض، جون ایلیا، امجد مرزا امجد، فرید احمد فرید، ساجد محمود رانا، عذرا ناز، طاہرہ زرتشت، محسن نقوی، صابر ظفر، واصف علی واصف، آدم چغتائی، احمد فراز، نوشی گیلانی، ڈاکٹر منور احمد کنڈے، سلیم فگار، بشارت احمد بشارت، عبدالجلیل عباد، جلیل نظامی، معراج فیض آبادی، منصور خوشتر، اطہر حفیظ فراز، شائق نصیر پوری، فہمیدہ مسرت احمد، مبارک صدیقی، شگفتہ شفیق، سلیم فگار، ہادی مونس، طارق احمد مرزا، عطاء المجیب راشد، عبدالقدیر کوکب،	2-8
دُوالمیال کا بھونچال	اے آر خاں لندن	9
نیشنل سینٹر فار فزکس اسلام آباد کا نیا نام	زکریا ورک کینیڈا	11
کمانڈر انچیف کا انتخاب	اے آر راجپوت	12
کیا آنے والا صدر امریکہ مشرق وُسطیٰ میں...	زبیر خلیل خان کروشیا	13
اُردو ادب کا امام و سحر نگار علّامہ نیاز فتح پُوری	ابن لطیف	15
گر نہ بودے در مقابل	احمد منیبؔ	16
پاکستان کے نامور سائنسدانوں کی ادبی خدمات	زکریا ورک ٹورنٹو	18
قلندر مومند۔ سپوتِ پاکستان	عاصی صحرائی	20
ثاقب زیروی	رانا عبدالرزاق خان	22
لفٹ	امجد مرزا امجد	24
سوانح عمری	اے آر راجپوت	27
احمد ندیم قاسمی ذات و صفات	ابراہیم افسر بھارت	28
افسانچے	دیپک بُدکی بھارت	31
حاصل مطالعہ	عاصی صحرائی	33
دُنیا کے امیر ترین بحری جہاز	فراز حمید خاں	35
بھرم	عذرا ناز ریڈنگ	38
ایک شام عاصی صحرائی کے نام		40
غزلیات: آدم چغتائی، پروفیسر ہادی مونس، طارق احمد مرزا، عبدالقدیر کوکب، عطاء المجیب راشد		41-42

غزلیات

نعت

احمد منیب

عجب ترکیب سے گوندھا ہوا ہے
بشر میں نور ہی سمٹا ہوا ہے
نہ ہو گا اُس کے جیسا نہ ہوا ہے
نوشتہ یہ بھی تو پورا ہوا ہے
محمد ﷺ رحمتِ عالم جو ٹھہرا
محبت کے لیے پیدا ہوا ہے
جہاں جبرئیل کے بھی پر جلے تھے
وہ اُس منزل سے بھی گزرا ہوا ہے
مٹا سکتا ہے کوئی اُس کو کیسے؟
خدا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے
یہ دیکھو ایک نورانی مینارہ
زمیں پر آج پھر اُترا ہوا ہے
خلافت ہے بہ فیضانِ محمد ﷺ
مسیحا نے یہی لکھا ہوا ہے
جو یہ نورانیوں کا سلسلہ ہے
اَزَل سے تا اَبد پھیلا ہوا ہے
محمدؐ رہنما ہے مقتدیٰ ہے
مرے دل پر یہی کندہ ہوا ہے
محبت نوچ لے گا دل سے میرے
عدو کو کس قدر دھوکا ہوا ہے؟
سروں کی فصل کاٹو! ہم نے اِس کو
جگر کے خون سے سینچا ہوا ہے

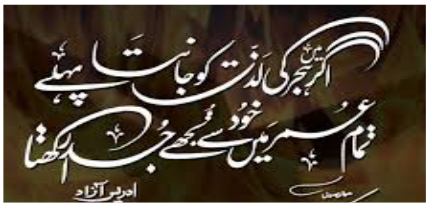

عوام

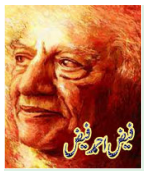

فیض احمد فیض

آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ اُن کا
جہاں بھر کی دھتکار اُن کی کمائی

--*

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مرجانے والے

--*

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بُھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

غزل

جون ایلیا

خوش گزران شہرِ غم ، خوش گذراں گزر گئے
زمزمہ خواں گزر گئے ، رقص کناں گزر گئے
وادیِ غم کے خوش خرام ، خوش نفسان تلخ جام
نغمہ زناں، نوازناں، نعرہ زناں گزر گئے
سوختگاں کا ذکر کیا، بس یہ سمجھ کہ وہ گروہ
صرصرِ بے اماں کے ساتھ، دست فشاں گزر گئے
زہر بہ جام ریختہ، زخم بہ کام بیختہ
عشرتیانِ رزقِ غم، نوش چکاں گزر گئے
اس درِ نیم وا سے ہم حلقہ بہ حلقہ صف بہ صف
سینہ زناں گزر گئے، جامہ وراں گزر گئے
ہم نے خدا کا رد لکھا نفی بہ نفی لا بہ لا!
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے
اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پا کے بدگماں
کتنے یقیں بچھڑ گئے، کتنے گماں گزر گئے
مجمعِ مہ وشاں سے ہم زخمِ طلب کے باوجود
اپنی کلاہ کج کیے، عشوہ کناں گزر گئے
خود نگران دل زدہ، دل زدگانِ خود نگر!
کوچۂ التفات سے خود نگراں گزر گئے
اب یہی طے ہوا کہ ہم تجھ سے قریب تر نہیں
آج ترے تکلفات دل پہ گراں گزر گئے
رات تھی میرے سامنے فردِ حساب ماہ و سال
دن، مری سرخوشی کے دن، جانے کہاں گزر گئے
کیا وہ بساط اُلٹ گئی، ہاں وہ بساط اُلٹ گئی
کیا وہ جواں گزر گئے؟ ہاں وہ جواں گزر گئے

دیس کی صورت

امجد مرزا امجدؔ

کیسی صورت ہے دیس کی میرے
کچھ بدلتا نظر نہیں آتا
ایک ہے جو امیر کا بیٹا
کیک کھائے روٹی نہیں کھاتا

دوسرا بیچے ہے گردوں کو اپنے
تاکہ بچوں کا پیٹ بھر جاتا
وہی چہرے بدل کے آئیں
ایک ہے جاتا تو دوسرا آتا
ہر سیاسی ہے بس ایک لوٹا
عوض نوٹوں کے ہے بک جاتا
ہے اُس کو گولی اُٹھاتی آخر
کرسی پر جو چپک ہے جاتا
جو بھی لُوٹ کے دیس سے بھاگے
وہی لندن میں جا چھُپ جاتا
گر ہوتا جگہ اُن کی امجدؔ
ڈوب کر چُلّو میں مر جاتا

غزل

ساجد محمود رانا

عجیب لوگ ہیں کیسے قرار دیتے ہیں
بنامِ دین جو انساں کو مار دیتے ہیں
کسی طرح کا بھی مرہم اَثر نہیں کرتا
جو مجھ کو زخم مرے غمگسار دیتے ہیں
یہ کس بدن کی تھکن روز آہ بھرتی ہے
یہ کس کو روز صدائیں مزار دیتے ہیں
ذرا سا بچ کے میں رہتا ہوں پارساؤں سے
ذرا سی بات پہ بے موت نار دیتے ہیں
وگرنہ ہم سے نہیں جیت دُور ہے ساجدؔ
اگر کہو تو یہ بازی بھی ہار دیتے ہیں

غزل

احمد منیبؔ

کیسے بتاؤں تم کو کہ ہمت نہیں رہی
مت سوچنا کبھی بھی کہ چاہت نہیں رہی
ہم سب غلام خواہشوں، مجبوریوں کے ہیں
اب یہ نہیں کہ ہم میں حمیّت نہیں رہی
کیوں اپنی زندگی کا لہو پی رہے ہیں ہم
کیوں اپنی زندگی سے محبت نہیں رہی
خونِ جگر جلاتے رہے جس چراغ میں
اب اُس چراغ کی بھی حمایت نہیں رہی
دھرتی نے اشک دامنِ دل سے جدا کیے
کچھ آسماں کی چشمِ عنایت نہیں رہی
کچھ گھر کے لوگ دشمنوں سے جا کے مل گئے
کچھ دشمنوں میں عزت و غیرت نہیں رہی
کچھ دُکھ میں تیرے لذتِ کمیابیٔ یقیں
کچھ میری شاعری میں نزاکت نہیں رہی
اک مصرعِ سخن میں سخن کا چراغ ہو
یا مصرعوں میں اب وہ کرامت نہیں رہی
کچھ ربط اصل سے ہو کسی اصلِ ذات کا
یا وصل کی وصال سی لذّت نہیں رہی

غزل

عذرا ناز

اپنا بن کر لوٹتے ہو تم مرے ایثار کو
یہ تو سوچو کیا کہیں گے لوگ ایسے پیار کو
جیسے کوئی نیم پاگل،جس طرح خبطی کوئی
پہروں ایسے دیکھتی ہوں میں در و دیوار کو
بے بہ بے کیں آپ نے مجھ پر جفائیں ہر قدم
کر دیا پھر بے صدا آئینۂ اظہار کو
کیسی آندھی تھی کہ پتے سب اُڑا کر لے گئی
پل میں تنہا کر گئی ہے جو ہرے اشجار کو
توڑ دیں میں نے غلامی کی وہ زنجیریں سبھی
رکھ دو اپنے ہاتھ سے اب ظلم کی تلوار کو
اب ہو نازاں میرے سر سے سائباں کو چھین کر
ایک دن ترسو گے تم بھی سایۂ دیوار کو
تم تو کہتے تھے تمہاری آبرو ہوں، جان ہوں
داستانیں اب سناتے ہو مری اغیار کو
اب زمانے میں بھروسہ کس پہ عذراؔ کیجیے
ناگ بن کر ڈس لیا ہے یار نے اس یار کو

لفظ ہوتے تو کہہ چکا ہوتا

(فرید احمد نوید)

کاش ایسا کبھی ہوا ہوتا
درد منت کش دوا ہوتا
کاش اس رہگزار دنیا میں
میں ترے دور میں رہا ہوتا
مہر ہوتا تو روز فرقت کا
ہجر کی رات کا دیا ہوتا
میری بستی سے تیرے کوچے تک
چند لمحوں کا فاصلہ ہوتا
میں ترے ساتھ چل رہا ہوتا
اور یہ وقت تھم گیا ہوتا
تیرے قدموں کی دُھول بن کر میں
ساتھ تیرے کبھی چلا ہوتا
منزلیں روکتیں ہزار مگر
کون کافر وہاں رُکا ہوتا
ہر نظر ایک کیمیا ہوتی
ہر نفس ایک معجزہ ہوتا
میں ترے لمس کی حرارت سے
مر بھی جاتا تو جی اُٹھا ہوتا
کس قدر پیار ہے ہمیں تم سے
لفظ ہوتے تو کہہ چکا ہوتا
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"
ہو بھی جاتا تو ! کیا؟ ہوا ہوتا ؟؟

طاہرہ زرتشت نازناروے

دعا

اِک پاک صاف۔ دل مجھے اے پروردگار دے
پھر اپنے خاص نور سے اُس کو نکھار دے
عصیاں کا بوجھ دل سے میرے تو اُتار دے
دنیا و عاقبت میری، سنوار دے
پیاسی ہوں تیری دید کی کب سے اے دلربا
اے میرے چاندرُخ سے نقاب اب تُو اُتار دے
تیری عنائتوں کی ہوں، طلب گار ہر گھڑی
مانگوں گی بار بار مجھے، بار بار دے
سوز و گداز، رنج کیا، فکرو بلا ہے کیا
گر تو مجھ کو اپنا پیار تو اے غمگسار دے
دنیا کی چاہ دل سے مرے تو نکال دے
مئے عشق کی پلا، پھر اُس کا خمار دے
مے خانہ چھوڑ کر نہ کہیں رند جائیں گے
قدموں میں اپنے رہنے کا بس اختیار دے
یوں فرد جرم کھول کر رُسوا نہ کر مجھے
اپنی ردائے مغفرت تو اے غفار دے
اے ناز اُس کے در پہ ہی تو جاکے بیٹھ جا
وہ دلنواز چاہے گر، تو بے شمار دے

غزل

واصف علی واصف

میں نعرہ مستانہ، میں شوخیٔ رِندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں، پی کر بھی کہاں جانا
میں طائرِ لاہُوتی، میں جوہرِ ملکُوتی
ناسُوتی نے کب مُجھ کو، اس حال میں پہچانا
میں سوزِ محبت ہوں، میں ایک قیامت ہوں
میں اشکِ ندامت ہوں، میں گوہرِ یکدانہ
کس یاد کا صحرا ہوں، کس چشم کا دریا ہوں
خُود طُور کا جلوہ ہوں، ہے شکل کلیمانہ
میں شمعِ فروزاں ہوں، میں آتشِ لرزاں ہوں
میں سوزشِ ہجراں ہوں، میں منزلِ پروانہ
میں حُسنِ مجسّم ہوں، میں گیسوئے برہم ہوں
میں پُھول ہوں شبنم ہوں، میں جلوہ جانانہ
میں واصفِ بسمل ہوں، میں رونقِ محفل ہوں
اِک ٹُوٹا ہوا دل ہوں، میں شہر میں ویرانہ

غزل

محسن نقوی

وہ درد، وہ وفا، وہ محبت تمام شُد
لے! دل میں ترے قرب کی حسرت تمام شُد
یہ بعد میں کُھلے گا کہ کس کس کا خُون ہوا
ہر اِک بیاں ختم، عدالت تمام شُد
تُو اب تو دُشمنی کے بھی قابل نہیں رہا
اُٹھتی تھی جو کبھی وہ عداوت تمام شُد
اب ربط اک نیا مجھے آوارگی سے ہے
پابندیٔ خیال کی عادت تمام شُد
جائز تھی یا نہیں، ترے حق میں تھی مگر
کرتا تھا جو کبھی وہ وکالت تمام شُد
وہ روز روز مرنے کا قصہ ہوا تمام
وہ روز دِل کو چیرتی وحشت تمام شُد
محسنؔ میں کُنجِ زیست میں چُپ ہوں پڑا
مجنوں سی وہ خصلت و حالت تمام شُد

غزل

آدم چغتائی

ہم اپنے گردو پیش سے یوں بے خبر رہے
اِس آس پر کہ ہم پہ تمہاری نظر رہے
وارفتگیٔ شوق لئے کُو بہ کُو پھرے
ہر دم مگر نظر میں ترے سنگِ در رہے
منزل کا بھی نشاں نہ ملا آج تک مجھے
کتنے خضر مثال میرے ہم سفر رہے
احساس بے گھری کا کچھ اتنا شدید تھا
دیوار و در کے سائے میں ہم دربدر رہے
ہم آسماں مزاج نہیں مشتِ خاک ہیں
پیدا ہوئے تھے خاک سے اور خاک پر رہے
ہر شخص نے مراد سے دامن کو بھر لیا
اپنے شجر چمن میں سبھی بے ثمر رہے
ہم نے رہِ سلوک میں سیکھا ہے یہ ہنر
آدمؔ وفا کا تذکرہ شام وسحر رہے

غزل

صابر ظفر

سب خوں میں نہانے جا رہے ہیں
چلئے کہ زمانے جا رہے ہیں
سنتے ہیں چشمِ مرگ وا ہے
ہم آنکھ ملانے جا رہے ہیں
کیا ساتھ ہمارے تم چلو گے
ہم لاشیں اُٹھانے جا رہے ہیں
عشاقِ وطن اَمر ہیں لیکن
کچھ ہم بھی تو مانے جا رہے ہیں
دھرتی ترے خاکسار ہیں ہم
چھلنی میں جو چھلنے جا رہے ہیں
جو چاہتے ہیں مٹانا ہم کو
وہ خود کو مٹانے جا رہے ہیں
سمجھے گا انہیں خدا کہ گھر کو
مقتل جو بنانے جا رہے ہیں
معلوم نہیں ہے ظالموں کو
کیا کچھ وہ گنوانے جا رہے ہیں
جاکے جو ظفرؔ نہ آئیں وہ لوگ
آنے کے بہانے جا رہے ہیں

غزل
احمد فراز

اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے اب منسوب قاتل سے ہوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

ہم چراغ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدر اور سحر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں پھرتا ہے احمد فراز
شہر نا پرساں میں تیری چشم تر دیکھے گا کون

غزل
بشارت احمد بشارت جرمنی

حسیں نظاروں نے صندلی بدن کو دیکھا ہے
میری نظر نے ترے بانکپن کو دیکھا ہے

جو حشر برپا کیا ان غزال آنکھوں نے
تو سجدہ ریز ہوئے ہر چمن کو دیکھا ہے

کسی نے دیکھا ہے جی بھر کے چاند چہرے کو
ہمارے دل نے تو غنچہ دہن کو دیکھا ہے

جو چاہا شوق نے اس مرمریں سراپا کو
کہا یہ دل نے کہ حسنِ جہاں کو دیکھا ہے

جھکی جھکی سی نظر اور شرم چہرے پر
عجیب تپش میں جلتے بدن کو دیکھا ہے

وہ بے مثال ہے جس نے تجھے بنایا ہے
تمہارے رُوپ میں اُس کے نشاں کو دیکھا ہے

زہِ نصیب مری آنکھ کے شہر میں ہو
قیام کرنے کو دل کے چمن کو دیکھا ہے

غزل
نوشی گیلانی

تتلیاں، جگنو سبھی ہوں گے مگر دیکھے گا کون
ہم سجا بھی لیں اگر دیوارودر دیکھے گا کون

اب تو ہم ہیں جاگنے والے تری خاطر یہاں
ہم نہ ہوں گے تو ترے شام وسحر دیکھے گا کون

سب نے اپنی اپنی آنکھوں پر نقابیں ڈال لیں
جو لکھا ھے شہر کی دیوار پر دیکھے گا کون

بے ستارہ زندگی کے گھر میں روشن ہے کہیں
اک کرن تیرے خیالوں کی، مگر دیکھے گا کون

غزل
ڈاکٹر منور احمد کنڈے

کیسا وہ گھٹا سایا تھا اِک
شجر پر تو فقط پتا تھا اِک

سبھی کے سر پہ تھی دستار رکھی
برہنہ سر مرا لگتا تھا اِک

کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا
مری پلکوں پہ کیوں ٹھہرا تھا اِک

نفرت کا تھا سنگِ میل پس پر
محبت کا رستہ تھا اِک

مجھے رونا کبھی آتا نہیں تھا
اسی بات کا رونا تھا اِک

مگر میں ہی وہاں تنہا تھا اِک

غزل
عبدالجلیل عباد

دے گیا یہ کون یہ پھر زخمِ شناسائی مجھے
دشتِ غربت میں بھی چھوڑے گی نہ رُسوائی مجھے

اجنبی ملتے ہیں راہوں میں بچھڑ جاتے ہیں
قافلے درد کے دے جاتے ہیں تنہائی مجھے

عمر بھر جاگتی ہیں آنکھیں ستارے گنتے
کرنی پڑتی ہے سیاہ راتوں کی صحرائی مجھے

سیلِ طوفاں کے بھنور سے ابھی نکلے بھی نہ تھے
کہیں لے ڈوبے نہ پھر دل کی دریائی مجھے

گرم موسم میں رکھیں آگ کے دل پر پھاہے
پھونک ڈالے نہ کہیں ایسی مسیحائی مجھے

غزل
سلیم فگار

مانا عُدو سے برسرِ پیکار میں نہیں
میدان چھوڑنے کو بھی تیار میں نہیں

کس نے کہا ہے خاک سے اُٹھنا نہیں مجھے
کس نے یہ کہہ دیا کہ فلک پار میں نہیں

مسمار کرنا چاہتا ہے کس لئے مجھے
اس عہدِ نو کی راہ میں دیوار میں نہیں

مجھ کو نہ دیکھ شک بھری چبھتی نگاہ سے
جو تُو سمجھ رہا ہے مرے یار، میں نہیں

شب بھر رہا ہوں تری فرقت کے دشت میں
یہ مت سمجھ ملول و عزادار میں نہیں

میں نور بانٹتے ہوئے دن کا رفیق ہوں
شب کی سیاہیوں کا، طرفدار میں نہیں

جو کچھ لکھا تھا بخت میں، میں نے کیا فگار
جو کچھ ہوا ہے، اس کا گنہ گار میں نہیں

غزل
جلیل نظامی

سنگ دل ہم سے بات کرتے ہیں
شعلے، شبنم سے بات کرتے ہیں

جن کے منہ میں زباں نہیں ہوتی
چشمِ پُرنم سے بات کرتے ہیں

یہ ''خوشی پی'' ہے اس کو کیا معلوم؟
آیئے! غم سے بات کرتے ہیں

پیار کی گفتگو کے ہم خواہاں
اور وہ درہم سے بات کرتے ہیں
وہ تھکا ہے نہ جی بھرا اپنا
سالِ ''دوّم'' سے بات کرتے ہیں
وہ اُدھر چپ ہیں ہم ادھر خاموش
دونوں البم سے بات کرتے ہیں
اہلِ زر تال چاہتے ہیں جلیلؔ
آپ ''سرگم'' سے بات کرتے ہیں

غزل
منصور خوشتر

چاہت کے چراغ اپنی جلانے کے لئے آ
بجھنے کو ہے لَو اُس کی بڑھانے کے لئے آ
اِک قید ہے میرے لئے اب بے رُخی تیری
اے جانِ وفا ! اُس سے چھڑانے کے لئے آ
ہر رات ترے قُرب سے رنگین تھی میری
گر جھوٹ ہے تو سچ ہی بتانے کے لئے
میں نے ہی محبت میں دیا ہے تجھے دھوکہ
الزام یہی مجھ پہ لگانے کے لئے آ
میں اِس کو بھی سمجھوں گا تری ایک محبت
''تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ''
شکووں میں بھی پوشیدہ ہوا کرتی وفا ہی
دل چاہے تو اظہارِ شکایت کے لئے آ
خوشترؔ کو گوارا ترا ہر جوڑ رہا ہے
اب تھوڑی محبت ہی جتانے کے لئے آ

غزل
فہمیدہ مسرت احمد

در مولا کے ہی گدا ہیں ہم
بے نیازی کے بادشاہ ہیں ہم
باعث اطمنان ہے یہ امر
بے آسروں کا آسرا ہیں ہم
دہن میں زبان اب بھی زندہ ہے
مت سمجھنا کہ بے نوا ہیں ہم
کبھی دنیا کو تھا گلہ ہم سے
اب زمانے سے خود خفا ہیں ہم
ایک تُو ہے کہ ہم سے بیگانہ
اک تیری یاد میں فنا ہیں ہم
چولی دامن کا ساتھ ہے اپنا
تو بدن ہے تیری قبا ہیں ہم
آدابِ محبت سے جو نہیں واقف
کہہ رہے ہم سے بے وفا ہیں ہم
رات بھر نیند کیوں نہیں آتی
کیا محبت میں مبتلا ہیں ہم؟
ہم فرشتے نہیں ہیں مسرتؔ
کب کہا تم سے بے خطا ہیں ہم

نعت
اطہر حفیظ فراز

اپنے ہر اک قول سے،اپنے ہر اک کام سے
کردے مجھ کو بہرہ یاب تو اپنے فیضِ عام سے
خالقِ کونین سے نا آشنا تھا یہ جہاں
پایا خدا کو ہم نے تو تیرے ہی انضمام سے
خورشید و مہ چمک اُٹھے ،رونق زمیں کو مل گئی
تیرے ہی دم قدم سے ہاں! تیرے ہی پاک نام سے
محبوبِ ربّ کبریا!! پہنچا تو اس مقام پر
جلتے ہیں پَر جبرئیل کے جس کے فقط ایہام سے
دن رات وہ درُود کے تحفے اُٹھائے لاتے ہیں
دنیا میں جتنے لوگ بھی واقف ہیں تیرے نام سے
صبر و قناعت سادگی تیرا ہی وصفِ خاص تھا
پیرہن بھی عام سے ،کھانے بھی تیرے عام سے
سورج تارے ماند ہیں تیری نظر کے سامنے
دیکھا ہے میں نے جھانک کے دیوار و در سے بام سے
آقا تیرے طفیل ہی فراز کو بھی ملے جزا
فیضِ نظر سے دیجئے اس کو بھی دُردِ جام سے

غزل
معراج فیض آبادی

بکھرے بکھرے سہمے سہمے روز و شب دیکھے گا کون
لوگ تیرے جرم دیکھیں گے سبب دیکھے گا کون
ہاتھ میں سونے کا کاسہ لے کے آئے ہیں فقیر
اس نمائش میں ترا دَستِ طلب دیکھے گا کون
لا اُٹھا تیشہ چٹانوں سے کوئی چشمہ نکال
سب یہاں پیاسے ہیں تیرے خشک لب دیکھے گا کون
دوستوں کی بے غرض ہمدردیاں تھک جائیں گی
جسم پر اتنی خراشیں ہیں کہ سب دیکھے گا کون
شاعری میں میرؔ و غالبؔ کے زمانے اب کہاں
شہرتیں جب اتنی سستی ہوں ادب دیکھے گا کون

غزل
شائق نصیر پوری

نئی بہار کے تازہ منظر جانے دو
پچھلی رُتوں کے زخم ابھی بھر جانے دو
کیسے کٹتا ہے دن جاناں، کیا جانو
کیا ہوتی ہے رات ستمگر جانے دو
دیوانہ تھا تیرے شہر سے چلا گیا
اور بھی ہیں کچھ باقی کافر جانے دو
اُس کو پاس بٹھا کے کافی باتیں کیں
بات اک بہت ضروری تھی پر جانے دو
طے کر بیٹھے ہو جانے کا شائقؔ جب
تم بھی جاؤ ہم کو بھی گھر جانے دو

بہترین ماہر معاشیات کا ایوارڈ ملنے کی خوشی میں ایک خوبصورت غزل اسحٰق ڈار کے نام

اَبر کے چاروں طرف باڑ لگا دی جائے
مفت بارش میں نہانے پہ سزا دی جائے
سانس لینے کا بھی تاوان کیا جائے وصول
سب سِڈی دُھوپ پہ کچھ اورگھٹادی جائے
رُوح گر ہے تو اُسے بیچا، خریدا جائے
وَرنہ گودام سے یہ جنس ہٹا دی جائے
قہقہہ جو بھی لگائے اُسے بِل بھیجیں گے
پیار سے دیکھنے پہ پرچی تھما دی جائے
تجزیہ کر کے بتاؤ کہ منافع کیا ہو
بوندا باندی کی اَگر بولی چڑھا دی جائے
آئینہ دیکھنے پہ دُگنا کرایہ ہوگا
بات یہ پہلے مسافر کو بتادی جائے
تتلیوں کا جو تعاقب کرے چالان بھرے
زُلف میں پھول سجانے پہ سزا دی جائے
یہ اَگر پیشہ ہے تواِس میں رِعایت کیوں ہو
بھیک لینے پہ بھی اَب چُونگی لگا دی جائے
کون اِنسان ہے کھاتوں سے یہ معلوم کرو
بے لگانوں کی تو بستی ہی جلا دی جائے
حاکمِ وَقت سے قزاقوں نے سیکھا ہوگا
باج نہ ملتا ہو تو گولی چلا دی جائے
کچی مِٹّی کی مہک مفت طلب کرتا ہے
قیس کو دَشت کی تصویر دِکھا دی جائے

غزل

شگفتہ شفیق

تو ہے ساتھی گر مرا تو کہکشاں ہے زندگی
تیری اُلفت ساتھ ہو تو شادماں ہے زندگی
مجھ کو دولت اور شہرت عزت و اُلفت ملی
سوچتی ہوں مجھ پہ کیسی مہرباں ہے زندگی
بعد مدت کے کُھلا یہ راز میرے دل پہ آج
تیرے بن اے دوست میری رائیگاں ہے زندگی
جب سے ہم کو تو ملا دل کی یہی گردان ہے
تو رہے جس بھی جگہ اپنی وہاں ہے زندگی
اے منافق یار میرے کیا کروں تیرا بیاں
ساتھ تیرے ایسے رہنا امتحاں ہے زندگی
نفسانفسی کا عجب عالم ہے صاحب دیکھیئے
اب تو یہ لگتا ہے جیسے بے اماں ہے زندگی
یوں مصائب نے شگفتہ گھر کا پیچھا لے لیا
لگتا ہے غم سے بھرا بس کارواں ہے زندگی

غزل

مبارک صدیقی

یہ رنگ میرے گلاب کردو، یہ ہجر میرے گلاب کردو
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر نگاہِ لطف و جمال کردو
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ سے گلاب خوشبو اُدھار مانگے
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر عنایتوں کا کمال کرد
بچھڑ کے تجھ سے میں ہجرتوں کی، غلام گردشوں میں کھو گیا ہوں
سو اے مسیحا ملو کچھ ایسے کہ دُور سارے ملال کردو
میں چاہتا ہوں بہشت والوں کو مجھ سے ملنے کی آرزو ہو
میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے پتھر کو بھی ستارہ مثال کر دو
میں ہجرتوں کی تمازتوں میں تری جھلک کو ترس گیا ہوں
سو مثلِ بارش برس برس کے، یہ رُوح میری نہال کردو
میں اپنی خوابوں کے روز دل سے کئی جنازے اُٹھا رہا ہوں
میں تیرا عاشق، سو میرے عہدے پہ جان مجھ کو بحال کر د

غزل

طاہر عدیم

تعلق توڑتا ہوں تو مکمل توڑ دیتا ہوں
جسے میں چھوڑ دیتا ہوں مکمل چھوڑ دیتا ہوں

محبت ہو کہ نفرت ہو بھرا رہتا ہوں شدت سے
جدھر سے آئے یہ دریا اُدھر ہی موڑ دیتا ہوں
یقیں رکھتا نہیں ہوں کسی کچے تعلق پر
جو دھاگہ ٹوٹنے والا ہو اس کو توڑ دیتا ہوں
میرے دیکھے ہوئے سپنے کہیں لہریں نہ لے جائیں
گھروندھے ریت کے تعمیر کرکے چھوڑ دیتا ہوں
عدیمؔ اب تک وہی بچپن وہی تخریب کاری ہے
قفس کو توڑ دیتا ہوں پرندے چھوڑ دیتا ہوں

انوکھے اشعار

رانا عبدالوحید خاں

اردو شاعری کی تاریخ میں بہت سے ایسے اشعار ہیں کہ جن کا پہلا مصرعہ اتنا مشہور ہوا کہ ان کا دوسرا مصرعہ جاننے کی کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی۔ تو کیا یہ مصرعے ایسے ہی تخلیق ہوئے یا ان کا کوئی دوسرا مصرعہ بھی ہے۔ جناب ان کا دوسرا مصرعہ پڑھیے اور سر دُھنیے۔

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ
نزاکت بن نہیں سکتی حسینوں کے بنانے سے
خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے
یہ راز تو کوئی راز نہیں، سب اہلِ گلستان جانتے ہیں
ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا
داورِ محشر میرے نامہ اعمال نہ کھول
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔
میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں۔
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کیخوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو
غم و غصہ و رنج و اندوں و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
آخر گِل اپنی صرفِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں اِس جہاں میں
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے
نہ گورِ سکندر نہ ہی قبرِ داراں
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا
جذبِ شوق سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے سے چلیں آئیں گے سرکار بندھے
قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستین کا
پھول تو دو دن بہارِ جاں فزاں دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
خوب پردہ ہے چلمن سے لگے بیٹھ ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے بھی ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دُوالمیال کا مذہبی بھونچال

اے آر خاں لندن

مقتلوں کے منہ کھلے ہیں شہر کے ہر موڑ پر - شکمِ مقتل بھر رہے ہیں دینِ ملاں کے امام

(آدم چغتائی)

عقیدت سے بہت جشن نبی تم نے منا ڈالا چراغاں کیلئے اللہ کا گھر تک جلا ڈالا (عرشی ملک)

دُوالمیال گاؤں چواسیدن شاہ کلر کہار، روڈ پر واقع ہے۔ جو چکوال سے 35 کلومیٹر دور ہے۔ آٹھ سو سال پہلے اس قصبے کی بنیاد شہاب الدین غوری کے ایک جنرل نے رکھی تھی۔ اس گاؤں نے اپنی شاندار فوجی خدمات کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ پہلی جنگ عظیم میں دوالمیال نے 460 جوان جنگ میں بھیجے اور دوسری جنگ عظیم میں 730 جوان بھیج کر دنیا میں ریکارڈ قائم کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں 36 جوان اور دوسری جنگ عظیم میں 9 جوانوں نے رُتبہ شہادت حاصل کیا۔ فوجی خدمات کے صلے میں منہ مانگا انعام توپ کی شکل میں بھی دیا گیا۔ جو کہ آج بھی دُوالمیال میں تالاب کے کنارے گاؤں کی زینت بنا ہوا ہے۔ جو کہ اس وقت جہلم سے بیل گاڑی پر لائی گئی تھی۔ یہ کام اس وقت ملک کیپٹن غلام محمد سینئر افسر نے سرانجام دیا تھا۔ پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی فوج میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس گاؤں میں پانچ لیفٹیننٹ جنرل بنے۔ اُن میں سے ایک کا مجھے علم ہے کہ جنرل نذیر ملک احمدی تھے۔ اور بہت سے جونیئر کمیشنڈ آفسر بھی تھے۔ بیس سے زیادہ کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ افسران کا تعلق اس گاؤں سے ہے جن میں اکثر احمدی تھے اور ہیں۔ اس گاؤں کی برادری اعوان قوم سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں کی مسجد 1860 میں تعمیر ہوئی۔ پھر 1890 کے بعد جب حضرت مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے دعویٰ امام مہدی کیا تو اس گاؤں کے نیک (اور امام مہدی کے منتظر) لوگوں نے اُن کی بیعت کر لی۔ آہستہ آہستہ نصف گاؤں کی برادری احمدی ہوگئی۔ آپس میں ساری برادری کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ بہت ہی محبت اور میل جول سے یہ برادری ایک سو پچیس سال سے زائد عرصے سے باہم رہتی چلی آئی ہے۔

اس مسجد کا مینار 1927 میں تعمیر کیا گیا۔ جو ہو بہو قادیان کے مینارے کی نقل ہے۔ اور احمدی ہی اس مسجد کے وارث اور متولی رہے۔ سارا روپیہ زیادہ تر ان لوگوں نے ہی خرچ کیا ہے۔ اب بھی یہ مسجد احمدیوں کی ہی ملکیت ہے مگر پھر یوں ہوا کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کا نعرہ لگا کر بھٹو صاحب آنازل ہوئے۔ خود نام نہاد مسلمان ہوتے ہوئے سعودی عرب کی سازش اور (مخالفین پاکستان) یزیدی ملاؤں کی شہ پر اپنے ہی محسن احمدیوں کو قانونی طور پر اپنے کرپٹ پارلیمنٹ ممبران سے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دلوا دیا۔ اور اس گاؤں کے احمدی بھی اس ظالمانہ قوانین کی مجبوری سے دوسرے محکمہ جات میں بھرتی ہونا شروع ہوگئے۔ کچھ لوگ اپنے رزق کی تلاش میں بیرون ممالک سدھار گئے۔ اور پھر گاؤں کے کم ذات اہالیان کو مسجد چھیننے کا خیال آیا۔ انہوں نے

ایک درخواست دائر کردی۔23 سال بعد میں 1997 ایک حکم جاری ہوا کہ مسجد کو سیل کر دیا جائے۔جس کے خلاف احمدیوں نے اپیل کردی۔ احمدیوں نے نماز کی ادائیگی اُسی مسجد سے ملحقہ گلی میں ادا کرنا شروع کردی۔آخر کار مسجد کا فیصلہ جماعت احمدیہ اسلامیہ کے حق میں ہو گیا۔ اور مسجد احمدیوں کو مل گئی۔

اب مُلاں کا طالبانی عدل، اور جہلاء کا دباؤ، فرقہ پرستوں کا تعصب اس کی ملکیت نام نہاد مسلمانوں کے نام کردے گا۔جس طرح یزید نے کیا تھا۔احمدی تو مظلوم اور کمزور ہیں اور صبر پر یقین رکھتے ہیں۔مگر اس اُمت کا یقین اللہ اور اس کے رسول پر نہیں ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکومتیں کس قدر غیر مسلموں سے خصوصاً اور اپنے ہی مسلمانوں سے کس قدر عدل وانصاف سے کام لیتے رہے ہیں۔اس دور کے نام نہاد مسلمان تو ہلاکو خان اور چنگیز سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔یہ کیا انصاف کریں گے۔مگر میرا خدا ایک منصف ہے وہ ضرور اپنے عدل کی چمکار دکھائے گا۔یہ حکومت جو کہ باقیاتِ ضیاع الحق ہے۔اس سے کوئی اُمید ممکن نہیں۔جماعت احمدیہ پاکستان میں عرصہ ۴۲ سال سے جبر وظلم کا شکار رہی ہے۔اس کی نصف صد سے زیادہ مساجد چھینی گئی ہیں بلکہ سیل بھی کی گئی ہیں اور پھر جلائی بھی گئی ہیں۔سینکڑوں احمدی کارکنوں کو دن دیہاڑے شہید کیا گیا ہے۔ان کی جائیدادوں پر ناجائز قبضے کئے گئے۔یہ اسلام کی تعلیم کے مطابق نہیں کیا گیا یہ اسلام آباد کی تعلیم اور لال مسجد کے برقع پوش مجاہدین کے حکم پر کیا گیا۔خدا دیکھ رہا ہے۔یہ ناکام شکست خوردہ عناصر جو بنگلہ دیش سے بھی بھاگے تھے، کشمیر سے بھی بھاگے ہوئے ہیں۔یہاں مذہب کے نام پر خون کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔اور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔عدل وانصاف ان کے گھر کی لونڈی بنی ہوئی ہے۔

دوسرا! یہ تو آپ کو علم ہے کہ شیطان تو انسان کیے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔اب ملک رشید آف کنیڈا جو اس فساد کی بنیادی جڑ ہے۔اس کی مالی معاونت سے پھر اس فتنے نے سر اٹھایا ہے۔باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا ہے، اور عید میلاد النبیؐ کے چکر میں پھر ختم نبوت کے نام پر سادہ لوگوں کو اشتعال دلا کر پھر فساد برپا کیا گیا۔انتظامیہ اور اکابرین جو پہلے ہی عدل وانصاف کا جنازہ پڑھ چکے ہیں۔ساری طاغوتی طاقتیں، اس ملک کو توڑنا چاہتی ہیں۔اور یہی مودودی، احراری، اسلامی، علمائے اسلام، علمائے جمیعت، خاکسار، طالبان، سپاہ صحابہ، جھنگوی، جن کے افراد و اصحاب اب تک اس ملک کے دشمن ہیں۔دہشت گرد، فتنہ گر، ایمان فروش اور جنت فروش ہیں۔اور اب RAW کے نمائندہ ہیں۔

ان لوگوں نے احمدیوں کو ہی نقصان دینا ہے۔احمدیت جوان کی ایک سو پچیس سال کی مخالفت کے باوجود ایک سایہ دار شجر بن چکی ہے۔جس کے پاس ایمان کی دولت ہے ایک خلیفہ وقت کی اطاعت میں دو صد ممالک میں پھیل چکی ہے۔اس کی ترقیات ان کے حسد کو بھڑکا رہی ہیں۔اس جماعت کا عالمی سالانہ بجٹ پاکستان کے سالانہ بجٹ سے کہیں زیادہ ہے، بین الاقوامی طور پر سب ممالک میں اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ اسلام کی مبلغ ہے۔ایک پُرامن جماعت جوان کے ظلم برابر جھیل رہی ہے۔پاکستان میں ہزاروں احمدی پابندِ سلاسل ہیں۔سینکڑوں شہادت کا رُتبہ پا چکے ہیں۔مگر جماعت احمدیہ پھر بھی پُرامن ہے۔اور اسلامی شرح پر سختی سے عمل پیرا ہے۔اپنے خدائے برتر کے حکم سے درودِ محمد ﷺ پڑھتے ہوئے سربسجود ہے۔کہ خدا ہی ہے جس کو عزت دے یا ذلت دے۔یہ نام نہاد مسلمان پاکستانی علمائے سُو کے پیچھے لگ کر تو اپنی عزت بھی اور ملک کی عزت بھی مٹی میں ملانے کے درپے ہیں۔اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے رستے سے سرگرداں ہیں۔

–

نیشنل سینٹر فار فزکس اسلام آباد کا نیا نام

عبدالسلام نیشنل سینٹر فار فزکس ۔ ۵ دسمبر ۲۰۱۶ء اسلام آباد

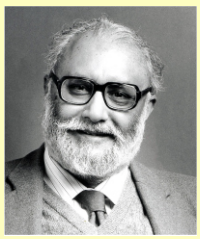

زکریا ورک کینیڈا

وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف کی طرف سے جاری کردے ایک سرکاری اعلامیے کے مطابق وزیر اعظم نے حکم دیا ہے کہ قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں واقع نیشنل سینٹر فار فزکس کا نیا نام پروفیسر عبدالسلام سینٹر فار فزکس میں تبدیل کر دیا جائے۔ وزیر اعظم نے یہ فیصلہ پروفیسر محمد عبد السلام (1926-1996) کی پاکستان اور سائنس میں کنٹریبوشنز کی وجہ سے تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو بیسویں صدی کی نظریاتی فزکس میں قدآور شخصیت تھے۔ فزکس میں ان کے اساسی کارناموں کی وجہ سے انہوں نے دو امریکن سائنسدانوں کے ہمراہ 1979 میں نوبیل انعام وصول کیا تھا۔ وزیر اعظم نے فیڈرل منسٹری آف ایجوکیشن کو ہدایت کی ہے کہ وہ نام تبدیل کرنے کے ضمن میں رپورٹ مرتب کر کے پیش کریں تا وزیر اعظم اس کی منظوری دے سکیں۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم نے فزکس میں پی ایچ ڈی کرنے والے پانچ طلباء کیلئے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے واسطے سے بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کیلئے منظوری دی ہے۔ اس فیلوشپ کا نام پروفیسر عبدالسلام فیلوشپ ہوگا۔ ڈاکٹر محمد عبد السلام پہلے پاکستانی اور مسلمان تھے جس نے سائنس میں سب سے پہلا نوبیل انعام حاصل کیا تھا۔ صدر پاکستان کے آپ پندرہ سال تک 1960-74 سائنسی مشیر کے عہدہ پر فائز رہے۔ پاکستان میں سائنس کے فروغ اور سائنسی اداروں کے قیام کے سلسلے میں آپ کی مساعی جمیلہ کے باعث آپ کو پاکستان کا بابائے سائنس قرار دیا جاتا ہے۔ آپ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے ممبر رہے، SUPARCO کی سپیس ایجنسی کے بانی، جب ۱۹۶۱ میں کراچی سے پہلا پاکستانی راکٹ رہبر فضا میں بھیجا گیا اس وقت آپ ڈاکٹر عثمانی کے ہمراہ لانچ سائٹ پر موجود تھے۔ کراچی نیوکلیئر پلانٹ کی خریداری میں رہنمائی کی۔ نیشنل سائنس کونسل کے ممبر جس نے 1970 رپورٹ شائع کی تھی۔ PINSTECH کے مرکز کیلئے مقام کا انتخاب آپ نے کیا تھا۔ 1974ء میں لاہور میں منعقد ہونیوالی اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کا ڈرافٹ پیش کیا۔ پانچ سو پاکستانی سائنسدانوں کی اعلیٰ تعلیم اور وظائف کیلئے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں انتظام کیا۔

F83 میں واقع آذان شہید پبلک سکول میں نوبیل انعام یافتہ سائنسداں ڈاکٹر عبدالسلام کا تصویری پوسٹر چسپاں کیا گیا ہے۔ اس کے تعارف میں First Muslim Pakistani کے الفاظ لکھے گئے ہیں۔

انٹرنیشنل نتھیا گلی سائنس سیمینار کا آغاز کیا۔

آپ کی خدمات کے اعتراف میں 1998ء میں حکومت پاکستان نے آپ کے نام کا دو روپے کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا۔ نیو مسلم ٹاؤن، لاہور میں عبدالسلام سکول آف میتھمیٹکل سائنسز 2003 سے کام کر رہا ہے جہاں ریاضی میں ڈاکٹریٹ کرنے والے ملکی و غیر ملکی طلباء کا انتظام ہے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں ڈاکٹر عبدالسلام چیئر فزکس کے شعبہ میں قائم ہے جس کے حامل اس وقت ڈاکٹر سلام کے شاگرد ڈاکٹر غلام مرتضی ہیں۔ ریاضی میں ذہین طلباء کو ہر سال عبدالسلام میڈل دیا جاتا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق کیپٹل ایڈمنسٹریشن اینڈ ڈیولپمنٹ کی جانب سے اسلام آباد کے مختلف سرکاری سکولوں میں مشاہیر پاکستان کی تصاویر چسپاں کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اسلام آباد کے 6 اور دیہی علاقوں کے 16، اسکولوں میں سیاسی، سماجی، مذہبی شخصیات اور سائنسدانوں کے تعارفی پوسٹر چسپاں کئے گئے ہیں۔ F83 میں واقع آذان شہید پبلک سکول میں نوبیل انعام یافتہ سائنسداں ڈاکٹر عبدالسلام کا تصویری پوسٹر چسپاں کیا گیا ہے۔ اس کے تعارف میں First Muslim Pakistani کے الفاظ لکھے گئے ہیں۔ نیشنل سینٹر فار فزکس کا نام ڈاکٹر عبدالسلام سے منسوب کرنے کا فیصلہ اگرچہ دیر سے ہوا ہے مگر نہایت مناسب ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس عظیم سائنسداں کی خدمات کا اعتراف کریں جنہوں نے پاکستان کا نام ہر جگہ بلند کیا۔

-

کمانڈر انچیف کا انتخاب

اے آر راجپوت

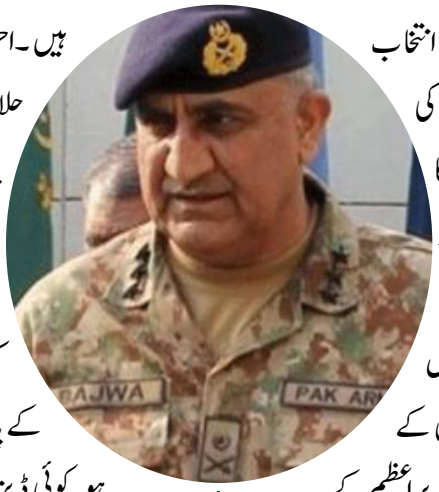

الحمد للہ پاکستان کی آرمی کے کمانڈر انچیف کا انتخاب بخیر و خوبی ہو چکا۔قواعد اور قانون اور وزیر اعظم کی صوابدید کے مطابق ہوا۔بہت ہی پیشہ ور جنرل کا انتخاب ہوا جو کہ ایک کہنہ مشق ہیں ۔جنگی حکمت عملی کو سمجھنے والے دانا اور عقلمند ہیں۔اب سب قیاس آرائیاں دم توڑ گئیں ہیں ۔یہ نام نہاد علامہ (اُلامہ) ساجد میر جس کو اسلام کے قوائد کی طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ جنرلوں کے لئے کوئی حلف ختم نبوت کا نہیں ہوتا۔صرف صدر اور وزیر اعظم کے لئے ہے کہ وہ قادیانی نہ ہو بے شک بھلے چور ڈاکو، شرابی، زانی، بے غیرت، بے ضمیر ہو۔(زرداری، نواز شریف، بھٹو، یحییٰ خان، جنرل رانی وغیرہ وغیرہ) اس نام نہاد خود ساختہ عالم کو کس نے حق دیا ہے کہ آئی ایس پی آر کو گائیڈ کرے۔اور آئی ایس پی آر کو ایسے جمعراتیوں کے آگے جواب دہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔اور پھر اس خبطی (ساجد میر) عالم کا جھوٹ کس طرح عیاں ہوا۔لعنت اللہ علی الکاذبین۔اب اسے شرم سے ڈوب کر مر جانا چاہیئے ۔کہ وہی جنرل سی این سی بنا۔جس کے خلاف کذب صریح بولا گیا۔ویسے دیکھا جائے جب سے حلف میں یہ نامناسب الفاظ آئے ہیں اس کے بعد ہمارے لیڈروں نے کیسی مومنانہ performance دی ہے۔کوئی مسٹر ٹن پرسینٹ سرے محل لے اُڑا تو کوئی رائیونڈ محل، پانامہ لیکس وغیرہ وغیرہ۔احمدیوں کے بغیر آپ کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ذرا گریبان میں جھانک کر دیکھو، اپنے معاشرہ کی طرف۔جس کو تم نے ہر طرح سے کنگال کر کے فقیر بنا دیا ہے۔پاکستان میں اگر کوئی افسر نیک شہرت والا نظر آئے تو خلقِ خدا آج بھی اُسے قادیانی یا احمدی سمجھنے لگ جاتی ہے۔احمدی اپنے عقیدے کے لئے نہ ہی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ ہی اپنے ایمان کو چھپاتے ہیں ۔وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر اس منافق اور کرپٹ معاشرے میں امن سے زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔تمہارے یہ نام نہاد مسلمان، بارش لونچڑے اور بازاری گماشتے توہین رسالت کے چکر میں سب اقلیتوں کو ڈرا کر اپنے پیٹ کے دوزخ کو بھرتے ہیں۔احمدی تو ان مکروہ اور کافرانہ دھندوں سے گریزاں رزقِ حلال کمانے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں ۔اخباروں کو پڑھیئے اور دیکھیئے یہ روزانہ جرائم کرنے والے لوگ کون ہیں۔قحط الرجالی کا سارے وطن کو چیلنج ہے۔ایک لمبی فہرست ہے سرکاری بزعم خود مسلمان کہلانے والوں کہ کہ جو بدترین لوگ ہیں اور گدھ کی طرح میرے وطن کے پاک جسم کو نوچ رہے ہیں۔کوئی لیڈر نہیں، جو دیانت دار ہو۔کوئی ڈیزل ہے۔کوئی اسلام آبادی ہے، کوئی لال مسجد کا بھگوڑا ہے۔تو اکوڑہ خٹک کا خود کُش بمبار، یا RAW ایجنٹ۔ڈاکو یا لٹیرا۔ادھر احمدیوں کے لیڈر کی شان دیکھو! جرمنی، یورپی پارلیمنٹ، برٹش، کنیڈا، امریکہ کی پارلیمنٹس اور سربراہ مملکت اُن کو خوش آمدید کہتے ہیں۔اور جب پاکستان کا کوئی نمائندہ ان ممالک میں جاتا ہے تو اس کے کپڑے اُتار کر اس کی اور سارے عملے کی بھرپور تلاشی لے جاتی ہے۔شرم تم کو مگر نہیں آتی ۔بنے پھرتے ہیں سرکاری مسلمان بزعم خود۔نماز قرآن سے تمہیں شرم آتی ہے ہرام کے عمرے سے دس دس حج عمرے کر کے خلقِ خدا کے سامنے اپنی پارسائی کے اشتہارات لگاتے ہو۔سنو! علمائے سُو اوران کے مطیع مسلم نما منافقین کا گروہ !تم نے پاکستان کا صرف چالیس سال میں منہ کالا کر دیا ہے۔تعمیر پاکستان میں اپنی بدنیتوں کی بدولت یکسر ناکام و نامراد رہے ہو۔آپ کو چور ڈاکو، شرابی، زانی، بے غیرت، بے ضمیر صدران اور وزرااعظم تو قبول رہے مگر اپنے باپ سعودی عرب (باغی خلافتِ عثمانیہ) اطاعت میں پاکستان بنانے والے احمدی قبول نہ رہے۔اور تم نے ساری دنیا میں اپنا نام و کردار بدنام کر لیا۔آج جو بھی سبز پاسپورٹ دیکھتا ہے۔نفرت اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ساری قوم کی تربیت یہ ملاں نہ کر سکا۔جو اس سارے کرپٹ نظام کی جڑ ہے۔اسلام کے نام پر اسلام آباد پر قابض ہے۔مسلم کو مسلم سے قتل لڑواتا ہے۔مدرسے بنا کر دہشت گرد پیدا کرتا ہے۔اغلام بازی کے اڈے مکہ کے ریال سے چلاتا ہے۔جو یحییٰ خان کو اور ضیاء الحق کو امیر المومنین تک بنا کر سارے وطن کو آگ

کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ جو پاکستان کو پلیدستان کہتا رہا۔اور اہل پاکستان کو جہلاء کا اک انبوہِ کثیر کہتا رہا۔ قائداعظم کو کافر اعظم کہتا رہا۔فوج کے مقابل طالبان کوشہید کہہ رہا ہے۔لال مسجد کو اسلحہ کا ڈپو بنا کر دیو بندی برقع پوش مجاہد بنا۔ساری عمر قیامِ پاکستان کا مخالف رہا جب پاکستان وجود میں آ گیا تو اسی ملک میں آن دھمکا۔تم ان شیاطین کے پیرو ہو۔تم لوگ بے عمل ہو۔مومن نہیں منافقین ہو۔سنو! پاکستان کو احمدیوں نے ہی بنایا تھا انہوں نے ہی بچانا ہے۔تم لوگوں نے ملاوٹ، رشوت، کرپشن سے اس مادروطن کو کھانا ہے ۔ احمدی، وزیر خزانہ، وزیر خارجہ، جرنیل، ائیر مارشل، سائنسدان، ماہر معاشیات، ڈاکٹرز، انجنیئرز، ہی اس مملکت خداداد کو اپنے اللہ کی مدد سے بچائیں گے۔ جب یہ لوگ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، تو اُس وقت پاکستان کہاں تھا اور اب کہاں ہے۔تم اپنے علمائے سُو کی اطاعت میں مُردوں سے خیرات مانگو یا اُن کی پوجا کرو یا شکم پُری کی خاطر در فرنگی سے بھیک مانگو، فرقہ واریت، اقربا پروری، کرپشن، لوٹ مار کو فروغ دو۔مسلم لیڈروں کو ووٹ دے کر ساری دنیا میں بدنام ہو کر اسلام کا نام بھی بدنام کرو کہ آپ کا یہی اصل مدعا ہے۔اناللہ و انا الیہ راجعون۔

-

اعلان

نیا سال قارئین کو مبارک ہو۔سب احباب سے گزارش ہے کہ ’’ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن‘‘ کا چندہ سالانہ 30 پونڈ ہے۔ اس کی ادائیگی کی طرف توجہ دیں۔ جو اس میگزین کا ممبر نہیں اس کا کوئی بھی مراسلہ آئندہ شائع نہیں ہوگا۔ بغیر سرمائے کے کوئی بھی نظام نہیں چل سکتا۔لہٰذا براہ مہربانی احباب اس طرف توجہ دیں۔ دوسری بات جو دیکھی گئی ہے کہ یہ رسالہ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک پہنچتا ہے۔

مگر اس کے بارہ میں تنقید و تائید بہت کم آتی ہے۔ یا تو بعض علمی احباب کچھ لکھنا نہیں چاہتے یا یہ رسالہ بعض کی طبائع میں انقباض پیدا کرتا ہے۔علمی احباب کی تعمیری راہنمائی سے ہم اپنا احتساب کرتے ہیں۔اور آپ کے خطوط سے ہمیں خوشی ہوتی ہے۔اور اس طرح ہم اپنا مستقبل کا لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ کچھ نہیں تو ضرور کوئی تبصرہ ہی ارسال کر دیں۔شکریہ۔

(ادارہ)

کیا آنے والا صدر امریکہ مشرقِ وُسطیٰ میں واقع اسلامی ممالک کے مسائل کو حل کر سکے گا

زبیر خلیل خان کروشیا

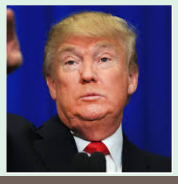

جنوری میں جب امریکہ کا نیا صدر چارج لیگا تو اس کے یہ الفاظ دنیا کو یاد ہونگے جو اس نے جنوری میں منعقد ہونے والی ریلی میں کہے تھے کہ ایران نے عراق لے لیا ہے، اب وہ یمن لینے جا رہے ہیں اور اس کے بعد شام لے لیں گے اور پھر ان کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو اس علاقہ میں ریجنل پاور کے لیے درکار رہتا ہے۔تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ چاہے مس کلنٹن صدر بن جاتی یا اب اگر ٹرمپ صدر بن جائے گا اس علاقہ کے مسائل جلد ہونے والے نہیں۔اور اس تجزیہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ علاقہ میں ماضی قریب میں رُونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا جائے۔

دراصل مشرقِ وُسطےٰ میں طاقت کا محور حاصل کرنے کے لیے ایران اور سعودی عرب میں مخاصمت جاری ہے۔اور اس مخاصمت کا عجیب پہلو یہ ہے کو دونوں ممالک براہ راست ایک دوسرے سے برسر پیکار نہیں ہیں بلکہ پراکسی وار کے ذریعہ کام چلا رہے ہیں۔1930 میں موجودہ صورت میں سامنے آنے والے ملک سعودی عرب کو اسلامی مقدس مقامات کی وجہ سے کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا اور وہ اسلامی ممالک میں لیڈر ملک کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔تاہم 1979 میں ایران میں بپا ہونے والے اسلامی انقلاب نے حالات کو تبدیل کر دیا۔ کامیاب اسلامی انقلاب کے بعد ایران کی مذہبی سلطنت کے دماغ میں اسلامی دنیا کی لیڈری کرنے کی خواہش انگڑائی لینے لگی۔ انقلاب کے فوراً بعد سعودی عرب میں موجود دس فیصد شیعہ مسلک کی حامل آبادی نے ایران کی شہ پر مسلک کو بنیاد بناتے ہوئے ایران کی حمایت میں پر کل پرزے نکالنے شروع کیئے تو سعودی حکومت کے کان کھڑے ہونے شروع ہو گئے اور اسی وقت سے اُنھوں نے ایران کو سبق سکھلانے کے لیے منصوبہ بندیاں کرنی شروع کر دیں۔ اسی منصوبہ بندی کی روشنی میں عراق کے صدر صدام کو شیشے میں اُتارا گیا اور

1980۔1988 کے سالوں کے دوران امریکی اسلحہ دلوا کر عراق کے ذریعہ ایران کو سبق سکھلانے کی سعی کی گئی۔ ایک ملین افراد کی اموات کے بعد ایران کو کچھ عرصہ کے لیے دوسرے ممالک میں دخل اندازی کے ذریعہ علاقہ میں اپنی چودھراہٹ کے منصوبہ کو موخر کرنا پڑا۔ تاہم اس کے بعد سعودی عرب امریکی گٹھ جوڑ کو توڑنا ایران کی ترجیح قرار پایا۔ اس دوران سعودی عرب کی حکومت نے 1989۔2002 کے عرصہ میں شیعہ مخالف مواد کو پوری اسلامی دنیا میں کثرت سے پھیلا دیا۔ جس کے نتیجہ میں سنی شیعہ فسادات بھڑکتے رہے۔ پھر 1990 میں عراقی صدر کو دھوکہ دے کر پہلے کویت پر حملہ کرایا گیا اور پھر امریکہ بہادر کو بلایا گیا اور کسی دوسرے ملک پر بے جا قبضہ کر لینے کے جرم میں امریکہ کو براہ راست دخل دینے کا موقع دیا گیا اور اس نے کویت میں اپنے فوجی مراکز قائم کر لیے۔ اس واقع کے بعد سعودی امریکی گٹھ جوڑ واضع ہو کر علاقہ میں سامنے آیا و ر ایرانی توسیع عزائم پر وقتی ٹھہراؤ آ گیا۔ امریکہ سے عبرتناک شکست کے بعد عراقی صدر پر جب اس دھوکہ دہی کا عقدہ کھلا تو وہ ایران اور سعودی عرب دونوں کے خلاف ہو گیا۔

اب ایسے باغی صدر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے امریکہ نے سعودی مشاورت کے بعد 2003۔2004 میں اس کی حکومت ختم کر دی۔ تاہم اس وقت تک ایران سنبھل چکا تھا۔ اور امریکی سعودی گٹھ جوڑ کو توڑنے کے لیے تیاری کر چکا تھا۔ عراق میں اکثریت شیعہ مسلک رکھتی ہے چنانچہ ایران نے مسلکی کارڈ کھیلا اور کامیاب ہو گیا اور عراق میں امریکہ اور سعودی عرب کو لوہے کے چنے چبوائے۔ عراق میں شدید خفت کے بعد سعودی عرب نے لبنان میں برسر اقتدار سنی مسلک کی حکومت کے ذریعہ پراکسی وار کا آغاز کر دیا۔ تاہم لبنان میں بھی مقابلہ کرنے کیے ایران حزب اللہ کو میدان میں لے آیا۔ 2005 میں اس وقت کے لبنانی صدر رفیق حریری نے جب سعودی چال کے نتیجہ میں ایرانی حمایت یافتہ شامی فوج کو واپس چلے جانے کا حکم دیا تو صدر لبنان کو قتل کرا دیا گیا۔ 2008 میں ایران کی حمایت یافتہ حزب اللہ کو بہت طاقت ملی اور بیروت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئی اور یہاں بھی ایران کی پراکسی وار کی وجہ سے سعودی عرب کو خفت اُٹھانی پڑی۔ سال 2011۔2014 بہت سارے عرب ممالک میں گڑبڑ ہوئی۔ سعودی عرب کو پورے مشرق وُسطیٰ میں اپنی پوزیشن کی شدید فکر لاحق ہوئی۔ اس نے خزانوں کے منہ کھولے اور اُردن، یمن اور مصر کی بے تحاشا مدد کی گئی اور ہر قسم کی انقلابی جستجو کو دبا دیا گیا۔ بحرین میں شیعہ آبادی نے سر اُٹھایا تو سعودی عرب نے بارہ صد فوجی بھجوا کر باغی افراد کو کچل دیا۔ سال 2013 میں مصر میں سول منتخب حکومت کو امریکی آشیر باد کے تحت سعودی عرب نے چلتا کیا اور ایک فوجی جنرل کو ملک کی باگ دوڑ تھما دی کہ وہ امریکہ اور سعودی عرب کا زیادہ وفادار ہے۔ لیبیا میں گڑبڑ کے بعد ہر اس جنرل کی مدد کی گئی جس نے سعودی عرب کی وفاداری کا یقین دلایا۔ شام میں موجودہ صدر جس کی ایران حمایت کرتا ہے اس کی حکومت گرانے کے لیے سر توڑ کوشش کی گئی لیکن یہاں بھی ایران نے حزب اللہ کے ذریعہ پراکسی وار لڑ کر سعودی عرب کو لوہے کے چنے چبوا دیئے ہیں۔ چار لاکھ افراد مارے جا چکے ہیں لیکن دونوں ممالک کی طاقت کے حصول کے لیے پراکسی وار جاری ہے۔

ایران کے ساتھ جوہری ہتھیاروں کے معاہدہ نے سعودی امریکی تعلقات میں بھی رخنے ڈال دیئے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں اب یہ خیال بھی تقویت پکڑ رہا ہے کہ مشرق وُسطیٰ میں ریجنل پاور بننے کے لیے ایران اور سعودی عرب جو جنگ و جدل برپا رکھے ہوئے ہیں اس جنگ جدل میں امریکہ کو کس حد تک ملوث ہونا چاہیے اور کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ مشرق وُسطیٰ کے اس سارے قضیہ میں روس کا کردار بھی اہم رہا ہے۔ موجودہ امریکی اور سعودی پالیسیوں کی مخالفت اور ایران کی پالیسیوں کی حمایت کیوجہ سے رُوس کا رُجحان ایرانی پلڑے کو بھاری بنا رہا ہے۔ نئے امریکی صدر نے بھی رُوس کے ساتھ بہتر تعلقات کا عندیہ دیا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ مشرق وُسطیٰ میں مسلک کے فرق کی وجہ سے جو ریجنل طاقت بننے کا قضیہ اتنے عرصہ سے چل رہا ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ سعودی عرب یا ایران کیا مل بیٹھ کر کسی حل پر متفق ہو جائیں گے یا یہ علاقہ جنگ و جدل کا میدان ہی بنا رہیگا۔ بظاہر تو حالات بہتر ہوتے نظر نہیں آتے باقی عالم الغیب تو خدا کی ذات ہے اور اس نے اس علاقہ کے لوگوں کے لیے کیا اسکیم بنا رکھی ہے اس کا وقت آنے پر ہی پتہ چلے گا۔ *--*

اُردو ادب کا امام وسحر نگار علّامہ نیاز فتح پُوری

ابن لطیف

علّامہ نیاز فتح پُوری جو متواتر نصف صدی سے زائد عرصہ تک برّ صغیر پاک و ہند کے اُفقِ ادب پر چھائے رہے۔ وہ عجیب وغریب اور حیرت انگیز انسان علم وادب کے میدان میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا۔ مگر ان بلندیوں تک پہنچنے کے لئے اس نے نرالی راہ نکالی۔ دنیا میں تین ہی قسم کے لوگ معراجِ شہرت کو پاتے ہیں۔

۱۔ روحانی رہنما، جنہیں آسمان کی تائید ونصرت حاصل ہوتی ہے اور جن کی راہ کی رکاوٹوں کو فرشتے دور کرتے ہیں۔ ۲۔ سیاسی لیڈر۔ جو جماعت اور جتھے اور سیاسی افکار وذہانت کے بل بوتے پر اپنی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ یا پھر فاتحینِ عالم جو انسانی لاشوں کے میناروں پر کھڑے ہوکر اپنی عظمتوں کا بگل بجاتے ہیں۔ لیکن علّامہ نیاز فتح پُوری نے بالکل نرالی اور انوکھی راہ اختیار کی۔ اس راہ پر ان کے قدم ارادی طور پر اُٹھ گئے تھے یا غیر ارادی طور پر، اس سے بحث نہیں۔ لیکن لاریب وہ ایک نرالی راہ تھی۔ وہ متواتر پچاس سال تک برّ صغیر کے مذہبی علماء کے دلوں کی پھانس بنا رہا۔ اور اُردو ادب کے شہسواروں کا سرخیل رہا۔ آج اُردو زبان کا کوئی ادیب زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے مگر اس کے نہاں خانہء دل کے گوشوں اور احساس کی تہوں میں چھپا ہوا یہ اعتراف موجود ہے کہ علّامہ نیاز فتح پُوری نے اپنے سارے دَور میں اُردو ادب کی صدارتی نشست کے قریب بھی کسی کو پھٹکنے نہیں دیا۔ علّامہ نیاز فتح پُوری نے ندوۃ العلماء لکھنو اور مدرسہ عالیہ رام پور میں تحصیل علم کے بعد پولیس اور محکمہ تعلیم کی ملازمتوں میں سے گزرتے ہوئے ایوانِ اُردو میں قدم رکھا۔ اور ۱۹۲۰ء میں اپنا مشہور ومعروف رسالہ ''نگار'' شائع کیا۔ جو ۴۶ طویل سال گزرنے کے بعد مرحوم کی وفات تک اتنے تواتر اور باقاعدگی اور اتنی شان کے ساتھ شائع ہوتا رہا کہ اُردو ادب کا کوئی پرچا اس کے مقابلہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ''نگار'' کے صفحات میں علّامہ نیاز فتح پُوری کے قلم سحر نگار نے وہ گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں کہ عقل محوِ حیرت ہوجاتی ہے کہ ایک اکیلا شخص علم وادب کے ہر میدان میں کس طرح عمر بھر دوڑتا رہا۔ یوں کہ تعاقب کرنے والے تھک تھک کر واپس ہوجاتے رہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ علّامہ نیاز فتح پُوری کے مذہبی خیالات اور رجحانات کیا تھے۔ اور نہ ہی اس سے کوئی غرض ہے کہ مذہبی مسائل میں نیاز کی راہِ حقیقت کے پسندانہ تھی یا نہ تھی لیکن ان کو جاننے والا ہے کوئی انسان جو حقیقت کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ نیاز نے جو راہ اختیار کی وہ اس پر مضبوطی سے قائم نہ رہا۔

بلا شُبہ وہ ایک مضبوط ارادے اور غیر متزلزل کردار کا مالک تھا۔ آپ اسے خاطی کہہ سکتے ہیں۔ آپ اسے غلطی خوردہ کہہ سکتے ہیں آپ اسے جادہ مذہبِ حقیقی سے منحرف ہونے والا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اُس نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں اس کی مضبوط قوتِ ارادی کارفرما تھی جو قُدرت کی طرف سے خاص انسانوں کو ودیعت کی جاتی ہے۔ ہندوستان بھر کے علماء کے بالمقابل وہ تنِ تنہا متواتر پچاس سال تک اپنے قلم کی تلوار لئے کھڑا رہا۔ اور ھل مِن مُبارِز؟ کا نعرہ لگاتا رہا۔ وہ ایک نرالے حُسنِ بیان کے ساتھ، ایک انوکھے اسلوبِ تحریر کے ساتھ، ایک حیرت انگیز طریقِ تخاطب کے ساتھ نگار کے صفحات میں چھپتا رہا۔ اس کی تحریر کی سج دھج میں وہ کشش تھی کہ علم دوست طبقہ اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔ اس کے قلم میں وہ مقناطیسیت تھی کہ ادب نواز حلقے اُسے اُردو ادب کا امام مانتے تھے۔ پھر دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نیاز کو کافر وملحد کہنے والے بھی ہر ماہ ''نگار'' کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ اُس نے مخالفتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سے گزر کر اپنے لئے روشنی کے مقامات مردانہ وار پیدا کئے اور اپنے عزم وارادے کی مضبوطی اور جرأتِ رندانہ کے بل پر اپنے لئے ایک مقام پیدا کیا، جو صرف اور صرف نیازؔ ہی کے لئے مخصوص تھا۔ اور جو ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو اسی کے ساتھ دفن ہوا۔ یوں تو نگار کے ہزاروں صفحات اپنے دامن میں ادبِ اُردو کے شہ پارے سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن نیاز کے قلم کی جولانیاں دیکھنی ہوں تو ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''من ویزداں'' کے اوراق میں جوش مارتی ہوئی نظر آئیں گی۔ علم کے ہر موضوع پر نیاز نے خامہ فرسائی کی ہے، اور اسے ہر موضوع پر پڑھتے وقت ایک قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ انسائیکلو پیڈیا پڑھ رہا ہے۔ قوتِ تحریر اور اسلوبِ نگارش کے ایسے ہتھیار قدرت نے نیاز کو عطا کئے تھے، جن سے یہ اپنے ہر قاری کے دل پر گہرا زخم لگاتا تھا۔ بہر حال دُنیائے علم وادب کی حیرت انگیز اور عظیم شخصیت اس دنیائے فانی سے اُٹھ گئی مگر اپنے پیچھے منطق اور استدلال کے بے شمار نقوش چھوڑ گئی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

گر نہ بودے درمقابل

احمد منیب

کسی بھی معاشرہ کی ترقی کا راز اس معاشرہ کے لیے دائیں بازو اور صاحب اقتدار میں ہی مضمر نہیں ہوتا بلکہ بائیں بازو کی قوتیں بھی اس میں بہت مثبت کردار ادا کرسکتی ہیں۔ کیونکہ انسان ایک نامکمل نہیں تو زیر تکمیل مخلوق ضرور ہے اور اس کی کمزوریاں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ہیں کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا کہ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ زیرِ تکمیل اس لیے کہا کہ یہ بھی ایک حسنِ ظن ہے اور بعض زیرِ تکمیل اشیا ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا حسن ہی ان کے زیرِ تکمیل رہنے میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ انسان بھی انہی زیرِ تکمیل اشیا میں سے ایک ہے۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ ہر جگہ دو قسم کی قوتیں کارفرما دکھائی دیتی ہیں ایک خیر کی قوت ہے اور دوسری شر کی قوت۔ بالفاظ دیگر پہلی کو لمّۂ خیر کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو لمّۂ شر۔ بڑے بڑے فلاسفر اس بات کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ اَضداد سے ہی اشیا پہچانی جاتی ہیں۔ عربی محاورہ ہے کہ وَبِضِدِّھَا تَتَبَیَّنُ الْاَشْیَآءُ کہ اشیا اپنی ضد یعنی اپنی الٹ سے پہچانی جاتی ہیں۔ فارسی میں ایک شعر بھی اس بات کی ترجمانی کے لیے بہت عمدہ ہے کہ:

گر نہ بودے درمقابل روئے مکروہِ سیاہ... کہ کس چہ دانستے جمالِ شاہدِ گلفام را

حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا حضرت! اتنی عقل کہاں سے سیکھی؟ فرمایا: بے وقوفوں سے! عرض کیا حضور! بے وقوفوں سے کس طرح؟ فرمایا: جو وہ کرتے ہیں میں ان کے اُلٹ کرتا ہوں۔ اَضداد میں رات اور دن کی مثال بڑی واضح ہے۔ اگر رات نہ ہو تو دن کی افادیت اور کیفیت واضح نہ ہو سکے۔ اگرچہ رات اپنی بہت بڑی افادیت رکھتی ہے لیکن اس وقت بحث روشنی اور اندھیرے کے لحاظ سے فرقِ محض کی ہے۔ عربی زبان میں اضداد کی بحث کے حوالے سے دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک علامہ جاحظ اور دوسرے علامہ حریری۔ علامہ جاحظ سیاہ رنگ کے بہ ظاہر خوب صورت انسان نہیں تھے لیکن علم دوست شخصیت تھے۔ آپ نے 159 نابغۂ روزگار کتب تصنیف کیں۔ ان کی وفات بھی اسی طرح ہوئی کہ اپنی لائبریری میں تھے کہ کتابوں کا ایک ڈھیر ان پر گرا، آپ شدید زخمی ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے میں تو ان کا ''شہیدِ علم'' کہتا ہوں۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف ''اَلْمَحَاسِنُ وَالْاَضْدَادْ'' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مقالات حریری میں ''دِیْنَارِیَہ'' کا اپنی زبان دانی، مضمون نگاری، نثری و نظمی سلاست و فصاحت و بلاغت مین کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ علامہ جاحظ ایک عالم انسان تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ خوبصورت نہ تھے بلکہ بہ ظاہر انتہائی بدصورت تھے لیکن بہ باطن بہت حسین تھے کیونکہ طبیعت میں شکر و احسان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ سے ملنے کے لیے آیا۔ خادم سے پوچھا کہ کیا علامہ گھر پر ہیں؟ نوکر نے جواب دیا کہ ہیں۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہیں؟ خادم نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔ وہ شخص بڑا حیران ہوا کہ علامہ جیسا نابغۂ روزگار، دُرِّ ساطع اور یہ کام!!! معاذ اللہ! پوچھا کہ جھوٹ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ پر! لیکن وہ کیسے؟ خادم نے جواب دیا کہ جب آپ نے آواز دی تو علامہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَاَحْسَنَ خَلْقِیْ کہ شکر ہے اس ذات بابرکات کا کہ جس نے مجھے پیدا فرمایا اور مجھے نہایت حسین صورت عطا فرمائی۔'' اب دیکھئے کہ علامہ جاحظ نے کیسے مثبت انداز میں سوچا اور خادم نے بھی اس میں سے ایک ذَم کا پہلو نکال لیا۔ بہرحال ظاہری بدصورتی اور باطنی خوب صورتی کا حسین امتزاج علامہ جاحظ میں ملتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر مدمقابل کچھ نہ ہو تو کسی چیز کی بھی کوئی اہمیت نہیں بنتی۔ قبح حسن کو ممتاز کرتا ہے، بدی نیکی کو، برائی اچھائی کو اور بدصورتی حسن و جمال کو۔ اسی طرح بدمعاشی شرافت کو اور حزبِ اختلاف حزبِ اقتدار کو اور نفرت محبت کو۔ وطنِ عزیز پاکستان کے سیاسی نظام کا سب سے بڑا منفی پہلو یہ ہے کہ صاحبِ ایوان، حزبِ اختلاف کو پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ کسی طرح

صاحبِ اختلاف یعنی بائیں بازو کی قوت کو کچل کر رکھ دیا جائے یا کم سے کم ایوان سے اُٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔یعنی وہ تنقید سے گھبراتے ہیں اور نہ تو سننا چاہتے ہیں نہ برداشت کرنا جانتے یں گویا وہ ایک ہی بات جانتے ہیں کہ ہم چونکہ اقتدار میں ہیں اس لیے میرے خلاف بات کہنا،لکھنا اور شائع کرنا نہایت درجہ ظلم اور بری بات اور موت کا پیغام لانے یا مقتل کے دروازے پر دستک دینے کے مترادف ہے۔یا کم از کم ایسے کسی شخص کو ایوان میں رہنے کا کوئی حق نہیں جو میری ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔حالانکہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرنا ہی تو عملِ مقبول اور امرِ احسن ہے۔دوسری طرف دیکھیں تو حزبِ اختلاف کی طرف سے بھی تو کوئی معیاری اور تعمیری تنقید سامنے نہیں آ رہی ہوتی بلکہ محض شخصیت پرستی،شخصی تنقید،کردار کُشی کے ساتھ ساتھ خواہ مخواہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جا رہا ہوتا ہے۔یہ تو مہذب اور متمدن اقوام کا شیوہ و وطیرہ نہیں نہ ہی کسی شریف انسان کو زیب دیتا ہے۔اس کیچڑ کے کالے چھینٹے قلبِ عوام تک بھی پہنچتے ہیں اور مثبت رویوں کو یہ بدنما سیاہ داغ دھبے ڈھانکتے چلے جاتے ہیں۔یوں سیاسی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سماجی برائیوں کو پنپنے کے لیے عمدہ موسم اور موافق حالات میسر آ جاتے ہیں۔بہ طور سیاسیات کے ایک طالب علم کے میری نگاہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس سمیت دیگر ترقی یافتہ ممالک کے آئین و دساتیر پر بھی ہے اور چین، بھارت اور پاکستان کے سیاسی حالات پر بھی۔میرا تجزیہ، مشاہدہ اور مطالعہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر میں محض یہ فرق ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں حکومت الگ چلتی ہے اور ترقیاتی کام الگ مستقل بنیادوں پر مستقل اداروں کے سپرد ہوتے ہیں۔حکومتی ایوان میں چاہے کوئی بڑے سے بڑا طوفان آ جائے یہ ترقیاتی کام بند نہیں ہوتے جن کی وجہ سے ملک مجموعی طور پر آہستہ آہستہ ترقی پذیری کی حدود سے نکل کر ترقی یافتگی کی سطح کو چھو لیتا ہے لیکن ترقی پذیر ممالک کا سب سے بڑا اَلمیہ یہی ہے کہ ان ممالک میں ترقیاتی ادارے،حکومتِ وقت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ایک حکومت برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے اپنے سے پہلی حکومت کے تمام تر ترقیاتی منصوبوں کو بند کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتی ہے اور سمجھ داری کا ثبوت نہیں دیتی۔یوں نہ تو اپنی مدت پوری کر سکتی ہے نہ کوئی ترقیاتی کام انجام پذیر ہوتے ہیں۔بار بار کے انقطاع کی وجہ سے دل بھی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ملک کی قوت خرید کمزور پڑ جاتی ہے۔مجموعی طور پر بے قدری کا عمل سامنے آ کر معاشی حالات میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے چنانہ منفی قوت کی طاقت بڑھ جاتی ہے اور وہ خیر کی قوت پر غالب آنے لگتی ہے اور مثبت رویوں کی بجائے منفی استعداد کی قوتیں فروغ پا جاتی ہیں۔

فورم خواہ سیاسی ہو یا سماجی، معاشی ہو یا اقتصادی ہر جگہ ایک معیاری حزبِ اختلاف کی تعمیری تنقید اور جذبۂ حب الوطنی اور عزمِ ترقی لے کر حزبِ اقتدار کے شانہ بہ شانہ چلنے سے ہی ملک کو ترقی پذیری کی شاہراہ پر کامیابی کے ساتھ گزار کر ترقی یافتگی کی منزل سے روشناس کروایا جا سکتا ہے۔بات ہم ملک کے کسی گاؤں کی کریں، کسی شہر کی کریں یا کسی صوبے کی۔ہر جگہ کا اپنا اپنا ایک سیاسی معیار ہے۔اس معیار میں لازماً دونوں حزب موجود ہوتے ہیں۔آج اگر ہم ایک دوسرے پر منفی تنقید کرنا بند کر کے تعمیری تنقید کے معیاری روّیے کو فروغ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمارا کل بہت روشن اور تاب ناک ہو سکتا ہے۔وگرنہ ہم کس قدر روشنی میں ہیں یا کس قدر اندھیرے میں! ہم سب بہ خوبی جانتے ہیں۔دونوں قسم کے گروہوں کو ملک کی ملکی اور قومی سلامتی و ترقی کے بارہ میں سوچنا ہوگا۔حزبِ اقتدار کو ہر صورت حزبِ اختلاف کا وجود تسلیم کرنا ہوگا جس سے اس کی صفات کا ظہور ممکن ہو سکے گا اور اس کا کو انجام دینے کی ایک سمت مختص ہوگی۔اس کے برعکس حزبِ اختلاف کو محض تنقیدی نہیں بلکہ تعمیری تنقید کر کے حزبِ اقتدار کا ساتھ دینا ہوگا تبھی ملک میں معاشی، معاشرتی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی ابتری کا خاتمہ کر کے ملک عزیز کو بچایا جا سکتا ہے۔ان ساری باتوں سے اس چیز کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ کسی نے کیا ہی سچ کہا ہے کہ:

گر نہ بودے درمقابل روئے مکروہِ سیاہ
کس چہ دانستے جمالِ شاہدِ گلفام را

سوچنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نیکی اور بدی کے راستے پیدا فرمائے ہیں، اپنے لیے رحمانیت چنی اور ابلیس کے لیے شیطانیت۔اب جو اللہ تعالیٰ کا ہے اسے تو رحمانیت ہی چننا ہوگی یعنی محبت اور اطاعت اور جو ابلیس کا ہے اسے شیطانیت یعنی بغاوت اور نفرت۔ *--*

پاکستان کے نامور سائنسدانوں کی ادبی خدمات

تبصرہ کتاب

زکریا ورک، ٹورنٹو

ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد نے 2012 میں عمران اختر کے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے ایم فل کا پر مغز مقالے کو کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ مجھے یہ کتاب ارض پاکستان کے ممتاز ماہر وقادر بین الاقوامی شہرت یافتہ جینیات دان ڈاکٹر انور نسیم ، صدر پاکستان اکیڈیمی آف سائنسز نے کینیڈا کے دورہ کے دوران مرحمت فرمائی تھی کیونکہ راقم نے عمران اختر کی ڈاکٹر عبدالسلام پر مقالہ لکھنے، مواد اور حقائق جمع کرنے، حوالہ جات، کتب ورسائل کے حصول، ایڈٹنگ، اور پروف ریڈنگ میں ان کے ساتھ تعاون کیا تھا جس کا اظہار تشکر انہوں نے انتساب اور تیسرے باب میں ڈاکٹر سلام پر میری کتب ومضامین کے حوالے سے احسن رنگ میں کیا ہے۔ ڈاکٹر انور نسیم، ستارہ امتیاز کے ساتھ عاجز کی شناسائی پچھلے 35 سال پر ممتد ہے جب وہ کینیڈا میں فیڈریشن آف پاکستانی سوسائیٹیز کے صدر تھے۔ اس کے علاوہ وہ ڈاکٹر سلام کے مداح اور قدردان بھی ہیں۔ اگست 2016ء میں انہوں نے اسلام آباد میں ڈاکٹر سلام کے 90 سالہ یوم پیدائش پر وسیع پیمانے پر سلام سیمینار منعقد کروایا تھا۔

اس انوکھی، اچھوتی، اور خرد افروز 268 صفحے کی کتاب میں پاکستان کے تین نامور سائنسدانوں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر عبد السلام، ڈاکٹر انور نسیم کی ادب میں خدمات کو تفصیل سے 199 صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ پانچویں باب میں اختصار کے ساتھ 8 ادیب سائنسدانوں کے احوال دئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر رضی الدین، میجر آفتاب حسن، عظیم قدوائی، ڈاکٹر صلاح الدین، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمد افضل غوری، ڈاکٹر خان محمد ساجد۔

پہلے باب ''سائنس اور ادب کے روابط واشتراکات'' میں مصنف سائنس کے مقصد اور ادب کے مقصد میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سائنس کا مقصد کائنات کو طبعی قوانین کی روشنی میں دیکھنا، انسانی زندگی کے مسائل، ان کا حل اور پیش آنیوالے حالات کا سائنسی طرز فکر کی روشنی میں اندازہ لگانا ہے جبکہ کائنات اور فکر کی تسخیر کا نام ادب ہے۔ ادب منظم طریقہ کار ہے جس کی مدد سے انسانی ذہن علم وادراک کی وسعتوں کو ایک نقطہ تک محدود نہیں کرتا بلکہ پوری کائنات کو موضوع بنا کر مرکزی نقطہ فکر کے شعوری حوالوں کو پیش کرتا ہے۔ ادب سائنسی طرز فکر کے دباؤ سے آزاد ہو کر تخلیقی عمل کا نام ہے۔ خیالات جب فکری سطح سے بلند ہو کر سائنسی فکر کے تابع ہو جاتے ہیں تو سائنسی طریقہ کار ایک شخص کو سائنسدان بناتا، جبکہ یہی خیالات ادراک کی جہتوں سے گزر کر عملی صورت میں اظہار پاتے تو ادب تخلیق ہو جاتا ہے۔

دوسرا باب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی 1897-1994 کی ادبی خدمات پر ہے۔ ڈاکٹر صدیقی بین الاقوامی شہرت کے حامل سائنسدان، بیک وقت قابل مصور، فلسفی ہونے کے علاوہ شعر و ادب پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ موسیقی کے دلدادہ، شطرنج ڈوب کر کھیلتے، اور کرکٹ سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ضخیم سے ضخیم کتاب چند گھنٹوں کے مطالعے کیلئے کافی ہوتی تھی۔ آپ ادب کے قدردان تھے، خود مقتدر شاعر اور فارسی شاعری بہت پسند تھی۔ ان کی مصوری کی نمائش امریکہ، پاکستان، ہندوستان اور جرمنی میں ہوئی تھی۔ حالانکہ کیمسٹری میں FRS تھے مگر فنون لطیفہ اور مصوری میں اپنی مثال آپ۔ آپ کو رائیل سوسائٹی کا فیلو ڈاکٹر سلام کی سفارش پر بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی پہلے سائنسدان تھے جس نے نیم کے درخت اینٹی فنگل، اینٹی بیکٹیریل، اینٹی وائرل اجزاء 1942ء میں حاصل کئے جس کی بناء پر آپ کو آرڈر آف برٹش ایمپائر کا ایوارڈ دیا گیا۔ زندگی میں 300 ریسرچ پیپرز اور 40 پیٹنٹ درج کروائے۔ آخر پر آپ کی زندگی کے اہم واقعات سن واردد ینے کے بعد 55 حوالہ جات دئے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا کہ

یہ ایک مستند اور باوثوق کتاب ہے۔

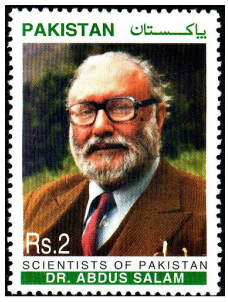

تیسرے باب کا تعلق پاکستان کے بابائے سائنس نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر عبد السلام (1926-96) کی ادبی خدمات سے ہے۔ پروفیسر عبد السلام تیسری دنیا کے انسانوں کے واحد نمائندے کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ وہ نوع انسانی کو دائمی زندگی بہم پہنچانے میں علم، فکر، کردار قربانی اور خلوص نیت جیسے اوصاف کریمانہ سے متصف تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ طبیعات دان تھے بلکہ وہ ایسے ادارے کی حیثیت رکھتے تھے جس نے مشرقی اقوام کو مغرب کی سائنسی ترقیات اور سائنسی منظرنامے سے متعارف کیا۔ نیز انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے سائنسدانوں اور مفکروں کو نئے سائنسی ماحول میں سانس لینے کا جواز فراہم کیا۔ تعلیمی میدان میں ان کی پے در پے کامیابیوں، سائنس میں ان کے شغف کو بیان کرتے ہوئے ان کی ادبی زندگی کی جھلک پیش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلام نے پہلا سائنسی مضمون 1943 میں سپرد قلم کیا اور آخری 1993 میں کیا تھا۔ ان کی تحریروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا پہلی وہ جن کا تعلق تھیوریٹیکل فزکس سے ہے اور دوسری جن کا تعلق پاکستان میں سائنس کی ترقی و فروغ اور تیسری دنیا میں سائنس کے احیاء سے ہے۔

ڈاکٹر عبد السلام سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے فلسفیانہ ذہن رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی باتوں سے فلسفیانہ افکار و روایات کی خوشبو آتی تھی۔ وہ ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے جس کا دل تیسری دنیا کی پسماندگی کو دیکھ پریشان ہوتا تھا۔ اکثر سائنسدان خود کو کسی ایک فیلڈ تک محدود کر لیتے ہیں مگر وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ سائنسی طور پر بھی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے ساتھ اپنی وابستگی ہمیشہ برقرار رکھی۔ ان کی بھرپور کوشش رہی کہ تیسری دنیا کے ممالک آپس میں مل بیٹھ کر ٹیکنالوجی کی ٹرانسفر کی بجائے خود سائنسی تعلیم اور فکر کو اپنے ملکوں میں روشناس کرائیں۔ انہوں نے بارہا سائنس کے حوالے سے پاکستان میں ٹیکنالوجی کی منتقلی کی بجائے سائنس کے رواج پر زور دیا۔

ڈاکٹر عبد السلام کو بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ تھا۔ نہ صرف آپ تحریر کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ ایک قادر الکلام انشاء پرداز بھی۔ ان کی ژرف نگاہی، بصالت فکر اور وسیع النظری کا ایک عالم معترف تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آپ کالج کے میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ سائنس کے میدان میں آپ 250 تحقیقی مقالہ جات صفحہ قرطاس پر اتارے، اور ایک درجن سے زیادہ کتابیں۔ آپ کی شاہکار کتاب آئیڈیلز اینڈ ریلیٹیز کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر عبد السلام سائنس میں اپنی دماغ سوز مصروفیات اور تناؤ کو کم کرنے کیلئے اکثر اوقات شاعری اور ادب کو اپنے لیکچرز میں شامل کر لیتے تھے۔ آپ فطرت کے نادر نمونوں کو سائنسی آنکھ سے دیکھنے اور ان کے حقائق کو ادب کی زبان میں بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی تحریر کا سٹائل دلفریب تھا۔ مضامین میں ادبی چاشنی اور دل کشی پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔ ان کی مکتوب نگاری میں غالب کا سا انداز تحریر تھا۔ مکتوب الیہ سے گفتگو کا آغاز کرتے اور ظرافت کی چاشنی کا بھی اضافہ کر دیتے تھے۔ تاریخ نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔

چوتھے باب کا عنوان ڈاکٹر انور نسیم کی ادبی خدمات ہے۔ اس علم دوست، ادب دوست، انسان دوست کا شمار عالمی سطح پر جانے پہچانے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ سائنس میں مصروفیات کے باوجود اردو ادب ادیبوں سے رابطہ استوار رکھا۔ آپ بین الاقوامی شہرت یافتہ جینیات دان ہیں۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا کہنا تھا کہ ادب اور سائنس میں حس حسن، قدر مشترک ہے۔ ادب اور سائنس کی اس قدر مشترک پر انور نسیم پورے اترتے ہیں۔ بہ حیثیت افسانہ نگار آپ نے جو لکھا وہ حقیقت کے قریب تر ہو کر لکھا۔ ان کے افسانوں کے کردار وہ خود ہیں۔ ان کے لہجے سے ہمیشہ سرشاری اور بلند آہنگی کی مہک آتی ہے۔ سائنس اور ادب میں ان کی دلچسپی متوازی خطوط پر استوار رہی۔

ڈاکٹر نسیم (ولادت 1935) نے راقم کو اپنے افسانوں کا مجموعہ وہ قربتیں یہ فاصلے عنایت فرمایا تھا۔ آپ کی افسانہ نگاری کے متعلق سید ضمیر جعفری نے کہا تھا کہ ان کی تحریروں میں ذہانت کی چمک، اخلاص کی خوشبو اور نگارش کی دل موہ لینے والی چاشنی ہوتی ہے۔ پاکستان کے نامور

ادیبوں دانشوروں ضمیر جعفری، فیض احمد فیض، منیر نیازی، انتظار حسین، جمیل الدین عالی شہزاد احمد، احمد ندیم قاسمی، مسعود مفتی کے ساتھ ذاتی اور ادبی تعلقات برسوں پر محیط ہیں۔

کینیڈا میں 23 سال قیام کے بعد سعودی عرب کے شاہ فیصل ہسپتال میں پرنسپل سائینٹسٹ رہے۔غیر ممالک میں 31 سال کے قیام کے بعد آپ 1993 میں پاکستان واپس لوٹ آئے۔گزشتہ کئی سالوں سے آپ پاکستان اکیڈیمی آف سائنسز کے صدر ہیں۔آپ تھرڈ ورلڈ اکیڈیمی کے ممبر ہیں 2016ء میں آپ نے ڈاکٹر سلام کے نوے سالہ یوم پیدائش پر پورے تزک و احتشام کے ساتھ سلام کانفرنس کا اہتمام اسلام آباد میں کیا تھا۔

پانچویں باب میں مسلمانوں کی سائنسی ترقی تاریخی تناظر بعد بیان کرنے کے بعد پاکستان کے جن ادیب سائنسدانوں کے مختصر سوانحی خاکے دئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر رضی الدین، میجر آفتاب حسن، عظیم قدوائی، ڈاکٹر صلاح الدین، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمد افضل غوری، ڈاکٹر خان محمد ساجد۔کتابیات کے ضمن 50 اردو کتابوں، 13 انگلش کتابوں 22 رسائل اور اردو اخبارات ، 8 جرنلز کے نام اور مستند حوالے دئے گئے ہیں۔جن افراد کے انٹرویوز کئے گئے ان کے نام درج ہیں نیز انٹرنیٹ کے جن ذخائر سے استفادہ کیا گیا وہ بھی دئے گئے ہیں۔

غرضیکہ یہ ایک نہایت مفید اور جامع کتاب ہے۔میری ذاتی لائبریری میں یہ اس شیلف پر ہے جہاں میری منظور نظر کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔کتاب پر ناشر کا نام اور ای میل درج ہے جب میں نے ان کو مزید کتابیں حاصل کرنے کی ای میل بھیجی تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ریٹائیر ہوچکے ہیں۔سرورق اور پرنٹنگ معمولی ہے۔*--*

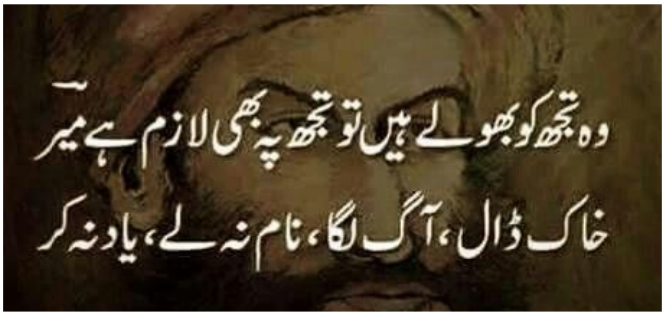

قلندر مومند۔سپوتِ پاکستان

عاصی صحرائی

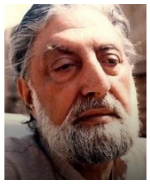

پشاور پریس کلب کے بانی چیئرمین اور خیبر یونین آف جرنلسٹس کے سابق صدر قلندر مومند جن کا اصل نام صاحبزادہ حبیب الرحمن خان تھا پشاور کے ایک سرحدی گاؤں بازید خیل میں یکم ستمبر 1930ء میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد صاحبزادہ سیف الرحمن خان جو خود ایک اچھے شاعر اور دینی درس وتدریس سے وابستہ تھے اور جامع فتح پور بھارت سے فارغ التحصیل تھے کی وجہ سے آپ کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا، جس کے سبب بچپن ہی سے لکھنے لگے تھے۔ صرف بارہ سال کی عمر میں ایک ہفت روزہ ''الحق'' کے نام سے نکالنا شروع کیا جو درجنوں کی تعداد میں ایک دستی پریس پر خود شائع کرتے اور صوبے کے علاوہ ہندوستان میں بھی اس کے خریدار تھے۔حضرت مرزا البشیر الدین محمود احمد بھی ہفت روزہ ''الحق'' کے خریداروں میں شامل تھے۔آپ نے پشاور شہر میں خالصہ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی جس میں آج کل فرنٹیر کالج فار ویمن قائم ہے۔میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔۱۹۴۷ء میں ایف اے پاس کیا۔اُس زمانہ میں فارسی کا طوطی بولتا تھا۔اپنے اکابرین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ نے فارسی اور پشتو میں امتیازی نمبروں میں منشی فاضل کیا پھر ۱۹۵۷ء میں پشاور یونیورسٹی سے گریجوایشن کے بعد ایم اے انگلش کیا، اور ۱۹۶۷ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔اور جوان العمری میں ہی اشتراکی تحریک سے وابستہ ہوگئے، اور گورنمنٹ کالج پشاور ہی میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوگئے، لیکن بعدازاں جلد ہی (1960ء میں) مارشل لاء کے دوران آپ کے سیاسی نظریات کی بدولت آپ کو ملازمت سے برخاست کردیا گیا تھا۔آپ نے 1973ء میں پشاور یونیورسٹی سے قانون (ایل ایل بی) کی ڈگری حاصل کی لیکن عملی طور پر قانون کے پیشہ سے وابستہ نہ ہوئے۔روزگار کے طور پر آپ نے صحافت کا رُخ کیا اور معروف انگریزی' اردو اخبارات خیبر میل (انگریزی)' انجام' بانگ حرم' شہباز (اردو) اور پشتو جرائد (لارِ ننگیالے راہبر) کے عملہ میں شامل ہوکر خدمات انجام دیں۔اور ژوند کے نام سے ذاتی مجلہ بھی نکالا۔سیاسی طور پر قلندر مومند پختون قوم پرست تحریک میں بھی نہایت سرگرم رہے اور خان عبدالغفار خان کے نہایت

قریبی معتمد سمجھے جاتے تھے۔ اپنے سیاسی نظریات کی خاطر انہیں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں۔ ایوب خان کے دور میں انہیں ایک سال تک شاہی قلعہ میں بھی قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ جبکہ سیاسی نظریات کے باعث انہیں پنجاب پختونخواہ اور سندھ کی مختلف جیلوں میں بھی طویل عرصے تک قید رکھا گیا۔ جب حیدرآباد سازش کیس میں نیشنل عوامی پارٹی کی ساری قیادت پر مقدمہ قائم کر دیا گیا تھا، تو قلندر مومند اس مقدمے میں خان عبدالولی خان اور ان کے دیگر ساتھیوں کے وکیل تھے۔ قلندر مومند کو بیسویں صدی کے پشتو ادب میں ایک نابغہ کی حیثیت حاصل ہے۔ پشتو زبان و ادب کے جدید دور پر ان کی شخصیت اور فن کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ انہوں نے شاعری سے لے کر افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، مضمون نویسی، انشاء پردازی، لغت نویسی، تحقیق، تنقید اور ترجمے تک میں نئی جہتیں متعارف کرائیں۔

ان کی شائع شدہ کتابوں میں سباؤون اور رنڑائی کے نام سے دو شعری مجموعے اور گجرے کے نام سے ایک افسانوں کا مجموعہ شامل ہے۔ تحقیق میں رحمان بابا کی کلیات اور دیوانِ ابوالقاسم کی اشاعت ان کا نمایاں کارنامہ ہے، جبکہ تنقید میں پٹہ خزانہ فی المیز ان اور دخیر البیان تنقیدی مطالعہ ان کی معرکتہ الآرا تصانیف مانی جاتی ہیں۔ ''دریاب'' کے نام سے پشتو کی اولین جامع لغت کی تالیف کا سہرا بھی محترم قلندر مومند کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے پشتو رسم الخط میں بھی تبدیلیاں تجویز کیں۔ اولسی ادبی جرگہ اور بعد ازاں دساھولیکوملکیو مرکہ کے تحت پختون شعراء و ادباء کو فعالیت کی ترغیب و تحریک دینا اور ادب سے دل چسپی رکھنے والے نوجوانوں کی تربیت کے لئے پلیٹ فارمز کی فراہمی ان کا ایک اور نمایاں کارنامہ ہے۔ آپ 1980ء میں گومل یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ساتھ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہوگئے اور جب اسے لاء کالج ڈیرہ اسماعیل خان کا درجہ دیا گیا تو آپ 1981ء میں اسکے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پشتو ادب کے شعبے میں آپ کی خدمات کے پیش نظر 1980ء میں آپ کو ''صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی'' عطا کیا گیا اور 1989ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو اقتدار میں آئیں تو بحالیٔ جمہوریت کے لئے قلندر مومند کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں وزیراعظم کی طرف سے قومی ایوارڈ برائے بحالیٔ جمہوریت سے نوازا۔ آپ عربی، فارسی اور پشتو کے ممتاز عالم تھے اور ہندی، سنسکرت، عبرانی اور لاطینی کے علاوہ بنگلہ، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور برصغیر کی مختلف دیگر زبانوں پر معقول حد تک عبور رکھتے تھے۔ آپ کو 1982ء میں حکومت صوبہ سرحد نے ایک جامع پشتو لغت مرتب کرنے کے منصوبے کا سربراہ منتخب کیا۔ آپ نے ابتداء میں (1982ء۔ 1991ء) اس منصوبے میں ڈائریکٹر کے طور پر اور پھر 1991ء کے بعد بطور مشیر خدمات انجام دیں۔ آپ کے علم و فضل، محنت و مستقل مزاجی اور انتہائی کوششوں سے کی بدولت 1994ء میں ''دریاب'' اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ پہلی یک لسانی (پشتو سے پشتو) جامع لغت ہے، جس سے زبان کے رسم الخط اور الفاظ کے تلفظ کی معیار بندی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ لغت صوتیات، الفاظ، ان کی اشتقاقیات، جامع معنی اور مترادفات، پودوں اور درختوں کے نباتاتی اور جانوروں کے حیواناتی ناموں جیسی بہت سی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔

1996ء میں ادب (تالیفِ لغت) کے شعبے میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری نے قلندر مومند کو ''ستارہ امتیاز'' کا اعزاز عطا کیا۔ آپ نے ایک طویل عرصے تک پشاور سے شائع ہونے والے اخبارات روزنامہ مشرق اور روزنامہ آج میں مستقل کالم نگاری کی۔ آپ کے افسانوں کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں پشاور یونیورسٹی میں آپ حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ (جالاوان مومند)۔ قلندر مومند کا شمار صوبہ سرحد کے عظیم پشتون ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم بازید خیل میں ہی حاصل کی۔ میٹرک پشاور سے پاس کیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی قوم پرستی کا رجحان غالب تھا اور ساتھ ساتھ صحافت سے بھی والہانہ لگاؤ تھا۔ آپ کا شمار پشتو ادب کے ترقی پسند لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ حق گوئی، نیک نیتی اصولوں پر عمل پیرائی سے آپ کی زندگی عبارت تھی۔ منافقت، دقیانوسی، خوشامد آپ کی ذات سے کوسوں دور تھی۔ جس بات کو حق جانا فوراً کہہ ڈالا۔ آپ ایک لمبا عرصہ درس و تدریس سے منسلک رہے۔ گورنمنٹ کالج پشاور، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں بطور پروفیسر خدمات انجام دینے کے بعد گومل یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی سے وابستہ ہوگئے، اور لاء کے شعبہ کے انچارج بھی رہے۔ 1982ء میں گورنمنٹ نے آپ کو ''پشتو ڈکشنری'' منصوبہ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا۔ آپ کی شب و روز کی محنت سے 70 ہزار الفاظ پر مشتمل ''پشتو ڈکشنری'' 1991 میں شائع ہوئی۔ قلندر مومند کا شمار بیسویں صدی میں پشتو کے بہترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہم عصر ادیبوں نے قلندر مومند کی خدمات کے اعتراف میں ان کو بیسویں صدی کا ''بایزید'' کا خطاب دیا ہے۔ آپ درجن بھر کُتب کے مصنف تھے۔ آپ 4 فروری 2003ء کو پشاور میں فوت ہوئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ثاقبؔ زیروی

تعارف شاعر

رانا عبدالرزاق

نام محمد صدیق ولد حکیم مولوی اللہ بخش قوم راجپوت وطن زیرہ ضلع فیروز پور (بھارت) تاریخ پیدائش ۱۱/ اپریل ۱۹۱۹ء تاریخ وفات ۱۳/ جنوری ۲۰۰۲ بمقام لاہور۔قدرت نے ادبی وصف کا بیج روزِ اوّل سے ڈال دیا تھا آنرز اِن اُردو ۱۹۴۷ء میں اور بی اے ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔''گنجینہ اُردو'' کے نائب مدیر بھی رہے، جبکہ مدیر احسان دانش تھے۔پھر اپنے مرشد کے کہنے کے مطابق مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر جیسے کہنہ مشق صحافیوں سے تربیت حاصل کی۔

کتب۔ہندوستان کی مٹی۔(افسانہ)۔کاربنکل کی تشخیص۔پنجابی میری زبان۔دورِ خسروی۔شہابِ ثاقب۔نویدِ منزل۔آہنگِ حجاز مجموعہ نعت رسول ﷺ ہے۔

ثاقب کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ہے اس کی طبیعت میں شرافت، سعادت، شرم حضوری اور دیانت فکر وعمل کی بنیادیں گہری ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں نوجوانی اور جوانی کے دونوں زمانوں میں کبھی بے نفسی بے راہ روی یا فکری آوارگی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔اور وہ ہمیشہ بندھے ٹکے اُسلوبِ زندگی پر کاربند رہے ہیں۔چنانچہ ان کی شاعری کو دیکھیئے فکر میں جدّت تو ہے ابتذال نہیں دین اور حمیت دین تو ہے ملائیت نہیں۔عشق تو ہے لیکن فسق کا شائبہ تک نہیں، غریبوں کی مصیبتوں پر آنسو ہیں۔موجودہ نظام عدم مساوات کے خلاف طیش ہے۔لیکن کمیونزم نہیں۔یہی اعتدال کا رَستہ اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ خوش گل، خوش گلو، سروقامت، مقطع داڑھی، شیروانی پوش، ثاقب زیروی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔اعلیٰ مشاعروں میں جہاں چیدہ لوگوں کا اجتماع ہو، ثاقب زیروی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے تھے۔وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں انتہا پسند نہیں تھے۔وہ ہر اعتبار سے میانہ رو، سلامتی پسند اور غیر حاسد قسم کے آدمی تھے۔ان کی یہی خصوصیت اُنہیں حلقہ احباب میں مقبول بنائے رکھتی تھی۔ثاقب زیروی کا شاعر ہونا اور اس حد تک دھانسو شاعر ہونا تاریخ ادب کا ایک عجیب وغریب واقع ہے۔عنفوانِ شباب میں ثاقب سب انسپکٹر تھے۔لیکن کون جانتا تھا کہ یہی سب انسپکٹر شاعری کی دنیا میں مقبول خاص وعام ہوجائے گا۔

میاں محمد شفیع کہتے ہیں کہ ثاقب زیروی انجمنِ اسلام کے ایک جلسے میں موجود تھے۔جب اُن سے شعر سنانے کی فرمائش کی گئی تو اپنے اشعار اور گداز ترنم کے بل پر پورے جلسہ پر چھا گئے اور اس دن سے ثاقب زیروی کے سامنے ایک اعلیٰ ادبی مستقبل اُجاگر ہوگیا۔خلوص اظہار، سوز وگداز اور خیال واُسلوب کی ہم آہنگی ثاقب زیروی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔خاص طور پر ان کی نعتیں حضوری قلب کا بہترین اظہار ہوتی ہیں۔اور اس مرحلہ پر اُردو کے بہت شعراء ان کی برابری کرتے ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ثاقب زیروی طبیعت اور فکر کے اعتبار سے مذہب پرست ہیں، اور وہ نعتیں خانہ پُری کے لئے نہیں لکھتے بلکہ احتیاج طبیعت اور طبعی رُجحان کے ماتحت لکھتے ہیں۔اور یوں ان میں صداقت، خلوص اور جذبہ کا رَچاؤ بھرپور انداز میں موجزن ہوتا ہے۔

تو حبیبِ ربِ جلیل ہے تیری عظمتوں کا جواب کیا
تو مقامِ فخرِ خلیل ہے تیری حُرمتوں کا حساب کیا
کہاں تو کہ باعث کُن مکاں کہاں فکر ثاقبِ خستہ جاں
بلا مدحتِ شہ اِنس و جاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

اس ایک نعت سے ہی ثاقب زیروی کے وفورِ جذبات اور عشقِ رسول کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ثاقب کے ہاں اسی قدر ونوعیت کی اور بھی کئی نعتیں بھی ملتی ہیں۔ثاقب زیروی شعروسخن کی عظیم رفعتوں پر فائز تھے اور خصوصاً نعت رسول ؐ کے بارے میں اپنے عاشقانہ رنگ، جذبہ فدائیت، جدّتِ استعارات، لطافتِ تخیل، تشبیہ کی خوبی، مضامین کی جامعیت، اور والہانہ اندازِ بیان میں آپ کا کلام اپنی نظیر آپ ہے۔نعت گوئی کے وصف میں یکتائے روزگار تھے، عشق محمد ﷺ آپ کا سرمایہ حیات تھا۔یہی وجہ ہے کہ شمع حُبِ نبویؐ آپ کے دل ودماغ میں پوری آب وتاب سے روشن تھی۔ثاقب زیروی کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے متفرق اور متنوع ہوتی ہیں۔لیکن اس میدان میں ان کا جذبہ حُب الوطنی کے گرد گھومتا ہے۔صبح دیانت، وطن، یاددہانی اور مجاہد وغیرہ یہ تمام نظمیں ملکی حالات کے متعلق ہیں۔المختصر ثاقب کی شاعری پاکیزہ باسلیقہ اور سلامت رو ہونے کے ساتھ ساتھ غنایت کی بھی حامل

ہے۔ان کی شاعری ایک اعلیٰ کلچرڈ کی طبیعت کی عکاسی کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں تاثر کا عنصر بدرجہ کمال پایا جاتا ہے، اور ہر سامع ان کے اشعار سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

باکمال صاحبِ قلم پر، پُرشکوہ دستاویزی اشاعت شائع کرنا ہر ادارے کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے، اور جس کی ۶۰ سالہ قلمی زندگی کی طویل صبر آزما جدو جہد کی داستاں کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔پھر بھی کچھ سر پھرے ادبی مجنوں یا لوح وقلم کی پرورش کی مرض میں مبتلا اپنے خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کررہے ہیں۔بقول شاعرِ مشرق۔

ع نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

ثاقب زیروی جیسی شخصیت پر لکھنا اس لئے بھی دُشوار ہے کہ بقولِ ثاقب صاحب کہ'' ہم جو تھے وہ نہیں رہے جو بننا چاہتے تھے وہ بن نہیں پائے'' ایسی شخصیت جس نے برصغیر کی ریاستوں کے عروج وزوال اور عزت دار گھرانوں کو گردشِ لیل ونہار کے باعث گم نام ہوتے دیکھا ہو۔جس نے خاندانی خون کے الرغم قول وفعل کے تضاد کو دیکھا اور اپنے جذبات کو اشعار میں قلم بند کیا۔ایسے شخص کے متعلق لکھنا اس لئے مشکل ہے کہ جس نے اپنی سیاسی بصیرت کو ہمیشہ فطرتی وکائناتی حقائق کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔جس نے اعتدال کے ساتھ ساتھ محبت و بھائی چارے کے وسیع کینوس پر اپنے نقشِ محبت کو اپنے عمل سے ثبت کیا۔جسے قدرت نے وصف عطا کیا کہ''کسی کی تحریر کے چند فقرے اور گفتگو کے چند مکالمے اس کے معیارِ وفا کے نقش بن کر ثاقب صاحب کے ذہن میں اُجاگر ہوجاتے تھے اور اس نقش کے مطابق ثاقب صاحب نے جس سے جو بھی تعلق قائم کیا اس کو ہمیشہ اس پر نازرہا'' یہ محض ان کے خالق و مالک کا فضل تھا، جس نے الفاظ کی پہچان اور ان کے اوزان کی صلاحیت اُنہیں ودیعت کی۔اسی کے فیض نے ہمیں ایک اچھا مصنف، اچھا شاعر و ادیب عطا کیا اس کے علاوہ ایک انسان دوست دیا جو بے غرض اطاعت اور بے پایاں محبت کا مجسمہ شاہکار ثاقب زیروی کی شکل میں دیا۔جس نے ہمیشہ اپنی تحریر لکھتے وقت ان باتوں کو مدنظر رکھا کہ''اس فقرے کے ملکی حدود میں کیا معنی کئے جاسکتے ہیں اور ملکی حدود سے باہر کیا؟ میرے دین کے لئے کیا مفہوم رکھتا ہے، اور بعد میں میری قوم پر کیا اثر چھوڑے گا، ایسی مستند تحریر لکھنے والی شخصیت پر لکھنا کچھ آسان نہیں''۔

بانی ہفت روزہ''لاہور'' ثاقب زیروی نے اُردو صحافت کی اعلیٰ روایات کو جس طرح زندہ تابندہ رکھا۔وہ اپنی جگہ مسلم لیکن وفا اور وضع داری کے اس پیکر کی ساری زندگی تا مرگ، ہر لمحہ ایک ہی لگن اور ایک ہی مشن پر قائم رہی'' اعلیٰ دینی اقدار کا قیام واستحصالی نظام کا خاتمہ رہی۔ثاقب زیروی صاحب سولو صحافت کا نادر نمونہ تھے۔برصغیر پاک وہند کی صحافت کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو کوئی مؤرّخ آپ کے نام کا ذکر کئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے گا۔تن تنہا پچاس سال تک ہفت روزہ'' لاہور'' سورج کی سی باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ثاقب زیروی نہ جانے کیا شے تھے۔وہ مقدمات بھی بھگتتے رہے، مبارک بادیں بھی سمیٹتے رہے، گالیاں بھی سنتے رہے، دعائیں بھی لیتے رہے، وہ مشاعروں کی جان تھے۔بڑے بڑے مشاعروں میں شائقین کی آنکھوں کے تارے تھے، اور دلوں کی دھڑکن، وہ جہاں صاحبانِ اقتدار کا دوست تھے اسی طرح غریبوں کا مونس وغمخوار بھی، وہ کبھی بڑے بڑے شاعروں کی موجودگی میں مشاعروں کو اُلٹ دیا کرتے تھے، اور کبھی پٹے ہوئے مشاعروں کو جما دیا کرتے تھے۔ان کی زندگی میں کئی نشیب وفراز بھی آئے، مگر وہ ویسے کے ویسے ہی رہے۔اُن کی باتوں سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا وہ تہہ بہ تہہ کھلتے تھے، مگر کم احباب پر، اور جن پر کھلتے تھے اُن کو اپنی محبتوں اور شفقتوں میں سمیٹ لیا کرتے تھے، اور وہ اُن محبتوں شفقتوں کا محور دیکھتا رہ جاتا کہ ایسا کس وجہ سے اور کیوں؟ آپ کے ہم عصروں میں فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، بابا کمل پوش، کلیم عثمانی، طفیل ہوشیارپوری، مولانا صلاح الدین، حکیم سعید، احسان دانش، ساغر صدیقی، سیف الدین سیف، مصطفیٰ زیدی، عدم، تاثیر، تبسم اسد ملتانی، کوثر نیازی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، تلوک چند محروم، رام لعل، مولانا تاجور نجیب آبادی، جگر مرادآبادی، علامہ نیاز فتح پوری، سردار دیوان سنگھ مفتون، م۔ش۔مجید نظامی، ن۔م راشد، نذیر شیخ، دوست جالندھری، مجید لاہوری، مولانا ظفر علی خان، سردار راجندر سنگھ بیدی، تھے۔جن کا گاہے گاہے ذکرِ خیر چلتا رہتا تھا۔ثاقب زیروی صاحب کی شخصیت اگرچہ نمایاں طور پر تبلیغ دین، شاعری، صحافت اور ادارت پر مشتمل تھی۔اس کے آگے دو پہلو تخصیص کے حامل یہ تھے کہ انہوں نے مشکلات کے باوجود اپنا مشنری ذوق ابلاغ عمر بھر جاری رکھا اور صحافت میں انہوں نے اُردو صحافت کا سب سے مشکل پہلو'' یک رکنی'' صحافت کا اختیار کیا تھا۔دنیا کی کسی زبان میں بھی ایسی صحافت مشکل ترین ہی ہوتی ہے۔لیکن اس طرح کی صحافت اُردو میں اس لئے خاص اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ مدیر کو باوصف نظریاتی اخلاص کے زندگی کے

سبھی پہلوؤں پر یکساں گہرائی کی نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔جس کے لئے مشاہدے اور مطالعے کا ہمہ وقت مجاہد بننا لازم ٹھہرتا ہے اس روایت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' مولانا محمد علی کا ''ہمدرد'' مولانا حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' اتنی بڑی مثالیں ہیں، کہ بعض دفعہ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے ۔کہ ثاقب زیروی صاحب نے ۱۹۵۲ء جیسے نامساعد حالات میں اپنے لئے اسقدر مشکل راستہ کیوں اختیار کیا۔لیکن ''لاہور'' کے پچاس سال گواہی کے لئے موجود ہیں، کہ انہوں نے نہ صرف انتخابِ درس کیا تھا بلکہ پورے تقاضوں اور شان بان کے ساتھ اسکو پورا رکھا اور جو سابق رواج خلوصِ کار اور ذاتی پاکیزگی کا تھا، اسے تابانی سے جاری رکھا۔ایسے دقیق مگر اوصافِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ ثاقب صاحب سے ملنے والے تمام لوگ یہ بھی گواہی دیں گے، کہ وہ شرح محمدؐیہ پر پورے طور پر تمام عمر کاربند رہے۔اور ساری عمر ایک سالک صوفی اور باعمل عالم کے طور پر گزاری۔ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں گل وبلبل، لب ورُخسار، ہجر ووَصال، شمع وپروانہ کا رونا نہیں رویا بلکہ انسان پر انسان کے ظلم کی داستان بھی بیان کی ہے۔انسان کی چیرہ دستیاں اور انسان کی مجبوریوں پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ثاقب زیروی نے اپنی شاعری میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ غربت کے چھپے ہوئے ناسوروں کو بھی ننگا کیا ہے ۔مذہب کے مقدس نام پر خوں ریزی کرنے والے جعلی مولویوں کو وطن دشمنوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ثاقب زیروی ایک درویش صفت شاعر ہیں۔اُن کے ساتھ ادیب، صحافی، اُمراء روساء کی خوشامد کر کے کروڑوں روپے، کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن گئے مگر ثاقب زیروی نے نہ کوئی کوٹھی بنائی اور نہ کوئی کار خریدی۔پاکستان بننے سے قبل وہ تحریک پاکستان کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے اور پاکستان کے لئے انہوں نے شب و روز کام کیا، اور ان کے بہت سے عزیز تقسیم کے وقت شہید ہوئے۔۱۹۵۲ء میں لاہور کی صحافت پر ایک ایک نئے روشن ستارے کی طرح طلوع ہوئے، اور آدھی صدی تک لوگوں کے دلوں میں اپنی نثر، اور شاعری سے جگمگاتے رہے۔آخر شہابِ ثاقب بن کر ٹوٹے، فضا میں روشنی بکھیرتے ہوئے اپنی حسیں یادیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔اُن کے قلم میں جادو تھا۔دوست نواز، عظیم شاعر، باکمال صحافی، ہنس مکھ ساتھی، غمگسار رفیق، بہترین اُستاد و دوست تھے

غزالاں تم تو واقف ہو کہ مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر ویرانے پہ کیا گزری

افسانہ

امجد مرزا امجد

لفٹ

رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے سڑک پر اکا دکا موٹر سائیکل یا کار ٹیکسی گزرتی تو بانو جلدی سے گھوم کر اسے ضرور دیکھ لیتی۔طویل سنسان سڑک پر خوبصورت چمکدار کپڑے پہنے ایک جوان حسین لڑکی کو تنہا جاتا دیکھ کر ہر گزرنے والا سوچتا کہ وہ رک جائے اور اسے اپنے ساتھ بھگا کر اس کی منزل مقصود پر پہنچا آئے مگر ابھی تک کسی کی جرات نہ پڑی تھی۔بانو دل ہی دل میں گزرنے والی کار کے بزدل ڈرائیور کو کوس رہی تھی اس کی ٹانگیں مسلسل چل چل کر تھکنے لگی تھیں اونچی ہیل کی سنہری پٹی والی جوتی اسے چبھنے لگی تھی کہ پیچھے سے اک کار نے ہلکا سا ہارن بجایا اور کار رینگتی ہوئی اس کے پاس آن رکی کار کی الیکٹرانک ونڈو ہلکی سی سرسراہٹ سے نیچے ہوئی اور ڈرائیون سیٹ پر بیٹھے ایک جوان سے آدمی نے اسے بڑی شائستگی سے پکارا۔''معاف کرنا آپ کو کہاں جانا ہے اتنی رات گئے اس طرح اکیلے ایسی جگہ آپ کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہ بنے!''

بانو نے بڑی ادا کے ساتھ بائیں ہاتھ سے اپنے لہریئے دار معطر گیسو پیچھے شانے پر پھینکے تو اس کا سارا جسم ایک بل سا کھا گیا...''جی پیچھے میری گاڑی خراب ہوگئی تھی ایک فرنیڈ کی برتھ ڈے تھی وہاں گئی تھی۔بس ادھر نزدیک ہی اتار دیجئے اگر آپ کو تکلیف...''''ارے نہیں نہیں میڈم'' اس شخص نے بانو کو بات پوری نہ کرنے دی اور اندر سے ہی ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ کھول دیا۔'' آپ شرمندہ نہ کریں آپ جہاں چاہیں گی میں پہنچا دوں گا۔آیئے آیئے پلیز!''اور بانو ایک جھپاکے سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی کار کی اندرونی فضا معطر ہوگئی اس شخص نے منہ پر شرمیلی سی مسکراہٹ لا کر لمبا سانس لیکر اپنے کانپتے ہوئے جسم پر ناکام قابو پانے کی کوشش کی اور خشک حلق کو منہ ہی منہ میں تھوک نگل کر گیلا کرتے ہوئے بڑی مشکل سے آواز نکالی۔''آپ کے گھر والے بھی پریشان ہونگے اتنی دیر ہوگئی ہے نا'' وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر اپنے پہلو میں ایک قیامت خیز کو بیٹھے پا کر اسے کوئی بات ہی یاد نہ رہی تھی۔گاڑی چل پڑی مگر بانو نے محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار بہت آہستہ ہے۔وہ زیر لب مسکرائی۔کتنے ہرجائی ہوتے

ہیں یہ مرد بھی۔ گھر میں خدمت گزار بیوی گود میں بچہ لئے اس کی منتظر ہوگی اور یہ زیادہ سے زیادہ کار میں پہلو میں بیٹھی ایک انجان حسین جوان لڑکی کے ساتھ گزارنے کی کوشش میں ہے۔''جی نہیں میں نے دوتین بار موبائیل پر کوشش کی ہے ابھی ڈیڈی ممی گھر پر نہیں آئے'' یہ کہہ کر بانو نے اپنے براؤن چمڑے کے پرس کو کھولا اور چھوٹا سا خوبصورت ماڈل کا موبائیل فون نکالا اور اپنے خوبصورت ہاتھوں کی مخروطی اُنگلیوں سے اس کے بٹن دبانے لگی کہیں دور کسی ٹیلی فون پر پانچ بار رنگ ہوئی اور اس نے بٹن دبا کر سوئچ آف کر دیا۔''مما پاپا ابھی بھی گھر نہیں پہنچے'' بانو نے خوبصورت ادا سے اپنی گردن دائیں جانب موڑ کر اسے کہا اور پھر شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ بہت کچھ سمجھا دیا۔''اپنا تعارف نہیں کروائیں گے'' وہ بولی۔''اوہ۔معاف فرمائیں مجھے خیال ہی نہ رہا'' وہ بانو کے فقید المثال حسن میں کھویا ہوا تھا۔''مجھے ندیم کہتے ہیں راجہ ندیم' میجر راجہ ندیم۔'' پھر وہ اپنی بوکھلاہٹ پر ہنسا۔اور شرمندگی میں اپنا ہونٹ کاٹے ہوئے بولا۔'' پنجاب سے تعلق ہے چند ماہ ہوئے کراچی تبدیلی ہوئی ہے اس شہر کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو سدھارنے کے لئے اب فوج کی خدمات حاصل کی گئی ہیں میں اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں ابھی ڈیوٹی سے آف ہوکر چھاؤنی جا رہا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔''''کس نوعیت کی ڈیوٹی ہے آپ کی۔''بدقسمتی سے کراچی میں دہشت گردی زوروں پر ہے ہر روز دوسرے روز لوگوں کو زدوکوب اور قتل کر کے پھینک دیا جاتا ہے ان کی نعشیں کبھی کسی نالے میں ملتی ہیں کبھی بوری میں بند کسی تاریک گلی میں سے برآمد ہوتی ہین ان کی بیخ کنی کے لئے ہم آفیسرز کا ایک گروپ تشکیل دیا گیا ہے۔''بانو نے اپنے چہرے پر مچلتے ہوئے گیسوؤں کی انگلیوں میں پروتے ہوئے پیچھے جھٹکا اور مسکرا کر بولی۔میجر صاحب ذرا سوچئے توجس ملک کے لیڈر اور سربراہ ملک کا اناج تک اسمگل کر کے باہر بھیج دیں اور ساری دولت غیر ملکی بنکوں میں ڈپازٹ کرا دیں اس ملک میں بوریوں میں سے لاشیں ہی برآمد ہونگی۔''یہ ایک الگ مسئلہ ہے قانون بھی تو کوئی مقام رکھتا ہے جو لوگ قانون توڑتے ہیں انہیں...'' بانو نے میجر ندیم کی بات مکمل نہ کرنے دی انہیں گاڑی موڑنے کو کہا اور پھر بڑی ادا سے مسکرا کر بولی میجر صاحب برا نہ مانیے گا۔ یہ گاڑی آپ کی ہے؟''جی''''جی ہاں چند ہی ہفتے ہوئے ہیں۔'' میجر ندیم نے بڑے فخریہ انداز میں بانو کو متاثر کرنے کے لہجے میں کہا۔'' بانو نے گاڑی آہستہ کرنے اور سامنے چوک سے دائیں ہاتھ موڑنے کا کہا یہ ایک فیشن ایبل علاقہ تھا بڑی بڑی عالی شان کوٹھیوں کی قطار تھی۔''آپ گاڑی سامنے گلی کے کونے پر کھڑی کریں۔'' ہم پیدل ہی گھر کی طرف جائیں گے بدقسمتی سے ہمارے پڑوسی بہت تنگ نظر قسم کے لوگ ہیں۔فوراً سکینڈل بنا دیتے ہیں...آپ...سمجھتے ہیں نا...'' وہ مسکرائی۔میجر ندیم کو ایسا لگا کہ اس کے چاروں طرف پھولوں کی بارش ہونے لگی ہے اور فضا خوشبو سے معطر ہوگئی ہے اسے سرور محسوس ہوا اور اس نے ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کردی۔ دونوں باہر نکلے ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی مگر بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ رات تنہائی ایک خوبصورت حسین دوشیزہ کا ساتھ ندیم نے پل بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے لمبا سانس لیا اس نے زندگی میں کبھی شراب نہیں پی تھی مگر آج بغیر پیئے وہ اپنے آپ کو گہرے نشے میں محسوس کر رہا تھا۔اس کو یکدم اندر کے میجر نے جگایا اس نے ہلکے سے سر کو جھٹکا جیسے یہ سرور یہ نشہ جھٹک دینا چاہتا ہو اور پھر اپنی فوجی افسرانہ چال میں سینہ پھلائے وہ گھوم کر بانو کی طرف آیا۔''آیئے میں آپ کی کوٹھی تک چھوڑ آؤں۔''

'تھینک یو میجر صاحب میں نے آپ کو بہت زحمت دی'' بانو نے بڑی ادا سے کہا۔''ارے نہیں آپ شرمندہ مت کیجئے۔وہ انکساری سے بولا چلتے چلتے بانو نے اپنا موبائیل فون نکالا اور چند نمبروں پر اپنی انگلی دبائی سر کو جھٹک کر بالوں کے پیچھے سے فون کو کان پر لگایا اور پھر بند کر کے بیگ میں رکھ دیا۔''دیکھا نا ابھی تک مما پاپا گھر نہیں آئے یہ لوگ جیسے امریکہ میں تھے ویسے یہاں بھی ہیں روز کسی نہ کسی پارٹی میں جانا اور ساری ساری رات غائب رہنا'' اس کے لہجے میں بیزارگی اور غصہ دونوں شامل تھے۔اتنے میں وہ ایک بڑے گیٹ کے باہر رکی بیگ سے چابیاں نکالیں گیٹ کا چھوٹا دروازہ چابی لگا کر کھولا اور اندر چلی گئی میجر ندیم ٹھٹکا اور باہر ہی رک گیا۔''پلیز میجر صاحب جب تک مما پاپا نہیں آتے آپ مجھے کمپنی دیجئے نا۔اتنی بری کوٹھی بہت ڈر لگتا ہے اگر آپ برا نہ منائیں...'' میجر کے چہرے پر چاندنی پھیل گئی۔ارے نہیں میں حاضر ہوں... چلیے وہ تڑپ کر گیٹ کے اندر آیا۔ڈرائنگ روم میں آکر میجر کو چکر آ گیا اس نے اتنی خوبصورت ڈیکوریشن اور اعلیٰ فرنیچر کا تصور بھی نہ کیا ہوگا بڑے سے اس کمرے کی ہر چیز سے گھر کے مکینوں کی امارت اور اعلیٰ ذوق کی تصدیق ہوتی تھی۔''بیٹھئے نا ...'' بانو نے بڑے ہی رومانی انداز میں میجر ندیم کو دیکھ کر کہا۔عجیب کیف و

مستی کا عالم طاری تھا اس پر وہ قیمتی دبیز صوفہ پر بیٹھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرم و گداز روئی کے ڈھیر میں دھنستا جا رہا ہے۔ ''نوکر تو اس وقت سو گئے ہونگے میں آپ کے لئے کچھ ڈرنک لے کر آتی ہوں۔'' وہ اپنی مخصوص خوبصورت مسکراہٹ بکھیر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

میجر ندیم نے اپنی آنکھیں بند کیں اور سر صوفے پر ٹیک کر لمبا سانس لیا بانو کی خوشبو اس کی سانسوں سے اندر جا کر ایک نشہ کی کیفیت پیدا کر رہی تھی وہ جوان تھا خوبصورت تھا اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور قیمتی کار کا مالک تھا۔ اور آج اسے ایک پری چہرہ حسین خوبصورت دوشیزہ کا ساتھ بھی تھا جو بے حد امیر پاپا کی شاید اکلوتی بیٹی ہے امریکہ سے آئے ہوئے ماڈرن لوگ ہیں وہ مسکرایا کہ اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی نرم صوفے میں اس نے اپنے دھنسے ہوئے جسم کو ذرا سا اٹھایا سامنے اسے کوئی نظر نہ آ رہا تھا اس نے صوفہ کے کناروں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی اس کا سر صوفہ کی پشت سے ذرا سا ہی اونچا ہوا کہ اس کے سر پر بڑی شدت سے ضرب لگی۔ ٹھس کی آواز کے ساتھ اسے لگا جیسے اس کا سر منوں بھاری ہو گیا اور درد کی ایک جان لیوا لہر اس کے سر سے ہوتی ہوئی سارے جسم میں دوڑ گئی وہ لڑکھڑایا مگر تندرست جوان مرد تھا جسم کی پوری طاقت جمع کر کے وہ تیزی سے اُٹھا کہ اسے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک لحیم شحیم فربہ اندام شخص دُھندلا سا نظر آیا جو تیزی سے صوفہ کی پشت سے آ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ بھی برق رفتاری سے اُٹھا اور پھر ٹھس کی آواز سے اس کے سر پر آہنی ضرب لگی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی درد سے اس کا جسم کانپ گیا ایک خیال اس کے درد سے چیختے ہوئے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ میرے ساتھ دھوکا ہو گیا... یہ تو وہی مجرم لوگ ہیں جن کی کھوج کے لئے ہماری خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور لڑکھڑا کر گر رہا تھا کہ ایک اور ہلکا سا دھما کا اسے اپنی گردن کے پیچھے محسوس ہوا۔ اس تیسری ضرب پر وہ اندھیروں میں ڈوب گیا اور بے جان لاش کی طرح صوفہ سے لڑھک کر قالین سے ڈھکے ہوئے فرش پر آن گرا۔ اس کا سانس رک رک کر چل رہا تھا۔ سر پر دو جگہ بڑے بڑے گومڑ نکل آئے اور ایک سے آہستہ آہستہ خون رسنے لگا۔ ''جلدی کرو نا ماموں ورنہ کارپٹ خراب ہو جائے گا۔''

بانو اپنے ہاتھوں میں کوک کا گلاس تھامے آ گئی اور اس موٹے سے پہلوان کو بولی۔ اس موٹے نے دو انچ آہنی پائپ صوفے پر پھینکا اور تیزی سے ایک کالے رنگ کا شاپنگ بیگ میجر کے سر پر چڑھا دیا اور رسی سے گردن تک لا کر باندھ دیا۔ اتنے میں ایک اور عورت جو گہرے میک اپ میں شوخ لباس پہنے ہوئے تھی کمرے میں داخل ہوئی اور مسکرا کر بولی۔ ''کار تو اس کی کافی قیمتی ہے آٹھ دس لاکھ تو دے جائے گی۔'' پھر اس پہلوان کو بولی جو میجر ندیم کو برہنہ کر کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا۔ ''اچھو بھائی تم اسے گیراج میں چھوڑ کر گاڑی فوراً پہنچا دو اور رقم نقد لانا' پچھلی بار بھی اس نے دو پھیرے کروائے رقم وصول کرنے میں اسے سختی سے کہنا کہ مال نقد نہ دو گے تو ہم دوسری پارٹی کو ڈلیوری دیں گے۔'' میجر کا بے جان جسم اچھو میاں گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے جا رہے تھے اور شوخ لباس میں ملبوس عورت میز پر پڑی رقم کو حیران سی دیکھ رہی تھی جو میجر کی جیب سے نکلی تھی۔

''آؤ بے بی سو جائیں تم بہت تھک گئی ہو گی آج رات بہت چلنا پڑا تھا نا''

''ہاں مما اب تو یہ کراچی کے لوگ کسی عورت کو بھی لفٹ نہیں دیتے اتنے ڈر گئے ہیں۔ یہ تو فوجی افسر تھا نا آج کل انہی کا راج ہے'' اور وہ دونوں ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ دو دن بعد اخبار کے ایک کونے میں چھوٹی سی خبر تھی لانڈھی کے علاقے میں ایک بند گلی میں پھر ایک لاش بوری میں بند ملی۔ جسے بہت بے دردی سے زدوکوب کر کے قتل کیا گیا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور مسخ شدہ چہرے پر پلاسٹک شاپر لپٹا ہوا تھا۔ لاش شناخت نہ ہو سکی نامعلوم قاتلوں کے خلاف پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے

-

سوانح عُمری

اے آر راجپوت

ہم جس دنیا یا کائنات میں رہتے ہیں وہ مختلف سانحات اور واقعات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جسے ایجازاً کیا تفصیلاً بھی بیان کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہی روزمرّہ کیا ہر ساعت کیا ہر منٹ اور سیکنڈ ایسے ایسے واقعات گزر جاتے ہیں جو اپنی دلچسپی دلآویزی اور ندرت کی وجہ سے اُس کائنات کے لئے جو کچھ بھی شعور وفہم وفراست رکھتی ہے صدہا نکات اور ہزاروں عبرتوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ شب وروز اگرچہ ہمارے مشاہدہ میں ایسے واقعات اور سانحات آتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو انہیں ضمیری مشاہدہ اور عبرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہوں یا اُن کے دلوں پر ان کا کوئی اثر پڑتا ہو۔ ہم اکثر سرسری رنگ میں سانحات اور واقعات کا مشاہدہ یا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ لا پروائی اور وہ غفلت جو ہماری زندگی کا رفتہ رفتہ لازمہ ہوتی جاتی ہے ہمیں بسا اوقات ان سانحات اور واقعات سے محض خالی اور کورا واپس لے جاتی ہے۔ جو ہماری زندگی کے واسطے ایک قیمتی سبق ہوتے ہیں۔ بعض وقت ہم کہا کرتے ہیں کہ ایسی غفلت نہ ہوتی تو ہماری چہیتی دنیا کا کام ہی نہ چلتا شائد یہ کسی حد تک درست بھی ہو مگر یوں کہا جاوے تو زیادہ تر درست ہوگا کہ ان حالات میں ہماری زندگیوں کی داغ بیل کی روش کچھ اور ہی ہوتی۔ انسان میں یہ طبعی اور فطرتی خاصہ ہے کہ وہ مختلف مشاہدات میں سے ایک حد تک انتخاب کرنے کا عادی ہے۔ اور اکثر اوقات نظائر اور تماثیل سے اُس کا دل اور دماغ بہت کچھ حاصل کرتا ہے اسی خیال سے وہ چیدہ چیدہ مشاہدات کے جمع کرنے کا عادی ہے۔ تاریخ اور تذکرات کی یہیں سے بنیاد پڑی ہے جب عام طور پر بعض واقعات کا بیان ہوتا ہے تو ایک تاریخ یا تذکرہ ہوتا ہے تحریر ہی اس کی حامل نہیں ہوتی حافظہ بھی بہت کچھ محفوظ رکھتا ہے سوانح عمریوں کی بنیاد بھی یہی ہے۔ لوگ عموماً اس امر کے مشتاق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہی ابنائے جنس کی زندگی کے حالات سے واقفیت پیدا کریں اور دیکھیں کہ ان کی زندگیوں اور دوسروں کی زندگیوں میں کیا کچھ فرق ہے۔ اسی لئے اور اسی شوق میں ہر ایک اور ہر قوم میں صدہا سوانح عمریاں لکھی گئیں کچھ دوسروں نے لکھیں اور کچھ خود ہی لکھنے والے لکھ گئے۔ ہر

سوانح عمری ایک خاص شخص کی زندگی اور رفتار زندگی کا ایک فوٹو ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس فوٹو کے کھینچنے یا کھنچانے میں کوئی نقص رہ گیا ہو اور اس وجہ سے اس پر نقطہ چینی ہوسکتی ہو۔ لیکن باوجود اس کے بھی اگر کوئی سوانح عمری نیک نیتی اور احتیاط سے لکھی گئی ہے تو اس سے دوسرے ابنائے جنس اخذ اور ترک کرکے سلسلہ یا شکل میں بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بعض لوگ سوانح عمریوں کو پڑھنے سے اس لئے بھی دل چراتے ہیں، ان کے خیال میں سوانح عمری وہی پڑھنے کے قابل ہوتی ہے جو نکتہ چینی کی زد میں نہ آسکتی ہو۔ اُن کے خیالات کے موافق ہو۔ یہ خیالات دُرست نہیں اختلافِ خیالات اور متضاد مذاق ہونے کی وجہ سے کوئی بھی ایسی سوانح عمری نہیں مل سکتی جو سب قسم کے خیالات کا مجموعہ ہو اور جس کو سب لوگ ہی پسند کریں۔

سوانح عمری ایک خاص شخص کے چیدہ واقعات اور رفتار یا اُفتادِ زندگی کا ذکر ہوتا ہے وہ بجائے خود اس شخص کی زندگی کا ایک ریویو یا ایک تنقید ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے مطبوعہ اور پرستیدہ خیالات کے ایسے شخص کی زندگی اور زندگی کے کارنامے کیا کچھ کیفیت اور قیمت رکھتے ہیں، پڑھنے سے پہلے ہی اپنے پرستیدہ خیالات کے ہجوم میں سے میخ نکالنا ہر تحقیق سے بعید ہے انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ پوری طمانیت سے حسنات کے اَخذ کی کوشش کرے نکتہ چینی کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ اس سے انسانی ذات کیا ملکوتی ذات بھی نہیں بچ سکتی جو شخص کسی کی زندگی کا ریویو کرتا ہے وہ دراصل پیش کردہ معلومات کے مطابق ایسی زندگی کے مختلف واقعات، کیفیات اور سانحات سے ایک مجموعی نتیجہ نکالتا ہے یہ جُدا بات ہے کہ بعض لوگ اس سے اتفاق نہ کریں لیکن واقعات کے پیش کرنے میں بہت کم اختلاف کی نوبت آتی ہے اس میں کوئی بھی شک وشبہ نہیں کہ انسانوں کے مختلف واقعات ایک ہی خیالات اور تنقید کے تابع نہیں رہ سکتے لیکن باایں ہمہ یہ واقعات اور رفتار زندگی خود ہی ایک فیصلہ کُن فیصلہ ہوتا ہے۔

معشوقہ عیاں مے گزرد بر تو و لیکن
اغیار ہمے بیند ازاں بستہ نقاب است

احمد ندیم قاسمی ذات وصفات

ابراہیم افسر بھارت

علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے بعد برصغیر ہندو پاک میں اگر کسی بڑے شاعر، ادیب، صحافی افسانہ نگار اور کالم نویس کا نام معلوم کیا جائے تو یقینا لوگوں کی زبان پر بے ساختہ احمد ندیم قاسمی کا نام آئے گا۔ اُردو کے اس عظیم شاعر ادیب، افسانہ نگر، صحافی نقاد پر لاتعداد مضامین و کتب تحریر ہو چکے ہیں۔ کتنی ہی یونیورسٹیز میں ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات سپرد قلم ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلوں نظموں اور افسانوں کو یونی ورسٹیز کے کورس میں شامل طلبا کو پڑھایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے فن پارے ہندی روسی جاپانی اور چینی اور انگریزی زبانوں میں تارجم ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کئی اخبارات و رسائل میں ان کی ادبی جہات پر خصوصی گوشے نکل چکے ہیں۔ احمد ندیم قادسی برصغیر کے واحد قلم کار ہیں جو بیک وقوت شاعر افسانہ نگار خاکہ نگار بچوں کے ادیب، مدیر، نقاد، صحافی اور کالم نگار ہیں۔ 2016 میں احمد ندیم قاسمی کی صد سالہ تقریب منا رہے ہیں۔ ان کی شخصیت ایک عہد ساز ادیب کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے نمائندہ ادیب و نقاد تھے۔ تاحیات وہ اس تحریک کی فکر و نظر سے متاثر رہے۔ احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس تحریک سے متاثر ہو کر انہوں نے جو اکتسابی ادب تخلیق کیا، اور اپنے فن میں جو بلند آہنگ پیدا کیا، اس کے بارے میں داکٹر سدید نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا۔ لکھتے ہیں۔

''ندیم کے یہاں ترقی پسندی رویہ اکتسابی ہے۔ ''دھڑکنیں'' کے قطعات ان کا مزاج رومانی ہے لیکن ترقی پسند تحریک نے انہیں بلند آہنگ ہونے پر مائل کیا۔ چنانچہ ان کے ہاں دو لہجے پیداہ ہو گئے۔ ایک لہجہ ان کی فکری رقّت کا غمازہ تھا۔ دوسرا غیر معمولی EUOPHORIA سے ہمکنار ہے۔ صدیق کلیم کے خیال میں ''قاسمی اس کوشش میں رہتا ہے کہ ذہن کو ماورئیت سے مادیت کی طرف رُجوع کرے۔ لیکن ان کی شاعری کی کمزوری نہیں بلکہ کہ قوت ہے'' معروضیت ندیم کے فن میں قیمتی عنصر ہے اور یہ ان کی موضوعاتی نظموں میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔''

(اُردو اب کی مختصر تاریخ صفحہ 444، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، 2013ء)

احمد ندیم کی وفات کے بعد پاکستانی ادب کی معمار سیریز کے تحت ''احمد ندیم قاسمی شکصیت اور فن'' نامی کتاب کو 2009ء میں ان کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی نے ترتیب دیا۔ یہ کتاب قاسمی کے ادبی کارناموں کا دستاویز ہے۔ اس کتاب کے پیش نامے میں احمد ندیم قاسمی کی ادبی جہات اور کارناموں کے بارے میں نگران اعلیٰ فخر زمان تحریر کرتے ہیں۔ ''احمد ندیم قاسمی کی دنیا میں ایک عہد ساز ادیب کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی بطور ادیب کئی جہتیں ہیں۔ شاعر کے طور پر انہوں نے ادب کو گراں قدر شاعری کے گراں قدر مجموعے دیئے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے اُن کے متعدد مجموعے افسانوی ادب میں مسلم کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحب اسلوب کالم نگار کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی ایک اور انفرادیت بطور مدیر ''فنون'' کی ہے وہ نہ صرف ''فنون'' کے مدیر رہے بلکہ ''ادب لطیف'' اور نقوش کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں غزلیں اقبال اور فیض کی شعری روایت کے بعد بہت اہم گردانی جاتی ہیں۔ انہوں نے افسانوی ادب میں لازوال کہانیاں تحریر کی ہیں۔ ان کی تنقیدی اور سوانحی تحریریں بھی اردو ادب میں حوالے کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی گراں قدر ادب تخلیق کیا۔ اُن کے کالم ہماری معاشرتی زندگی کے بھرپور عکاس ہیں اور اُن سے پاکستان کی معاشرت اور سیاست کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔''

(پاکستانی ادب کے معمار پیش نامہ صفحہ 7 تا 8 اسلام آباد 2009ء)

احمد ندیم قاسمی کی ولادت 20 نمبر 1916ء کو غیر منقسم ہندوستان کے گاؤں انگہ وادی سون سکیسر، ضلع خوشاب پنجاب کے ایک قبیلہ اعوان میں ہوئی۔ ان کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ اپنے پردادا محمد قاسم کی رعایت سے ''قاسمی کہلائے'' ان کے والد پیر غلام نبی اور والدہ غلام بیوی تھیں۔ احمد ندیم قاسمی کی تعلیم کی ابتدا قرآن کریم سے گاؤں کی مسجد میں ہوئی۔ 1931ء میں انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1933ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1935ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ احمد ندیم قاسمی انگریزی سے ایک ایم اے کرنا چاہتے تھے لیکن مالی

حالت خستہ ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ کالج لاہور کی فیس ادا نہ کر سکے اور ایم اے کرنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔1936ء میں انہوں نے پہلا افسانہ ''بدنصیب بت تراش'' تخلیق کیا جو رسالہ ''رومان'' میں شائع ہوا۔احمد ندیم قاسمی نے اپنی پہلی ملازمت 1936ء میں ریفارمز کمشنر لاہور میں بہ طور محرر کی۔اس کی بعد انہوں نے مختلف ادارہ جات میں خدمات انجام دیں۔ملتان میں ایکسائز سب انسپکٹر رہے۔ریڈیو پاکستان پشاور میں بہ حیثیت اسکرپٹ رائٹر کام کیا(خیال رہے کہ ادارہ تقسیم ہند سے قبل آل انڈیا ریڈیو کا حصہ تھا)''بزم اقبال'' کے اعزازی سیکریٹری بھی رہے اور مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی خدمات انجام دیں۔صحافت میں دلچسپی ہونے کے سبب'' تہذیب نسواں'' اور پھول نامی جریدوں کے ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔اس کے بعد حاجرہ مسرور اور خدیجہ مسرور کے ساتھ مل کر''نقوش'' کی ادارت بھی سنبھالی۔اس کے علاوہ''ادب لطیف''سویرا''''سحر''''امروز''''اقبال''''صحیفہ''اور رسالہ فنون(یہ ان کا ذاتی رسالہ تھا۔1963ء میں اس کا جراء کیا گیا۔)میں بھی اپنے کارہائے نمایاں ادا کئے گئے۔احمد ندیم قاسمی پر حکومت ہند کا عتاب کئی بار ٹوٹا۔حکومت پاکستان نے قاسمی صاحب کو SAFTY ACT کے تحت 1951ء اور 1959ء میں گرفتار بھی کیا۔

اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود قاسمی صاحب نے اپنے قلم کے جوہر اردو ادب کی ہر اصناف میں دکھائے۔قاسمی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز''نثری ادب'' سے کیا تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ''چوپال''1939ء میں منظر عام پر آیا تھا اس کے بعد 1941ء میں'' بگولے''،1942ء میں'' طلوع غروب''،1943ء میں'' گرداب''1944ء میں سیلاب،1945ء میں'' آنچل''1946ء میں'' آبلے''1948 میں'' آس پاس''1949ء میں '' درو دیوار'' 1952ء میں ''سناٹا''،1955ء میں ''بازار حیات''،1959ء میں '' برگ حنا''1961ء میں'' سیلاب و گرداب'' 1963ء میں گھر سے گھر تک''،1973ء میں'' کپاس کا پھول''1980ء میں نیلا پتھر''،1995ء میں''کوہ و پیما''،2007ء میں'' پت جھڑ''(افسانے اور ناولٹ)نے شائع ہو کر قبول عام کی نئی منازل طے کیں۔احمد ندیم قاسمی نے شاعری کی میدان میں قدم مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھ کر رکھا۔اس نظم کی بہت پذیرائی ہوئی۔یہ نظم روزنامہ''سیاست''میں شائع ہوئی۔

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھتا جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی نے غزل،نظم،قطعہ،رباعی،حمد،نعت سلام غرض یہ کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی شاعری میں شدید احساس،حالات کا صحیح تجزیہ،حیات انسانی کی حقیقی ترجمانی،خلوص وصداقت اور اسلوب کی پختگی نمایاں ہے۔احمد ندیم قاسمی نے اپنی شاعری کے لئے مواد اردگرد سے لیا۔کیوں کی ان کا بچپن خستہ حالی میں گزرا تھا۔پریشان حال لوگوں کے جذباتوں کی نمائندگی انہوں نے اپنی شاعری میں کی۔اس غزل سے ان کے جذبات و احساسات اور میری بات کی تائید ضرور ہو جائے گی۔

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقاء کا تھا
اس رشتہء لطیف کے اسرار کیا کھلیں
تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا
ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
چھپ چھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا
دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا
اس حسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی وہ تقاضا وفا کا تھا
حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیمؔ
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

''قاسمی کو نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔افسانہ نگاری میں بھی ان کا رُتبہ بلند ہے لیکن یہاں ان کی شاعری کے بارے میں گفتگو مقصود ہے۔قاسمی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بھی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ان کا شمار پیامی شاعروں میں ہے لیکن ان کا کلام نثریت اور خطابیت جیسے عیبوں سے پاک ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے غریبی کا درد خود سہا ہے۔اس لئے ان کی حمایت میں جو کچھ کہتے ہیں محسوس کر کے کہتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ درد میں وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔شعری وسائل سے وہ بہت سلیقے کے ساتھ کام لیتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو صفحہ 220 ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 2011ء)

جب احمد ندیم قاسمی ادبی اُفق پر طلوع ہوئے تھے۔ اُس وقت ادنی فضاؤں میں سجاد وحید یلدرم، نیاز فتح پوری، اور اختر شیرانی کی رنگین مزاج مگر سطحیت زور رومانیت کا بال بالا ہر سو تھا۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی کا مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے متاثر ہوکر اشعار کہنا اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ احمد ندیم قومی اور بین الاقوامی مصائب سے گہری واقفیت اور دل چسپی رکھتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کی شعری جہت فہم اور ادراک پر تبصرہ کرتے ہوئے رفعت سروش رقم طراز ہیں۔ ''احمد ندیم غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے سروکار، بہترین زندگی کی جدو جہد اور عصری تہذیب کے لئے ناقدانہ رویہ ہے۔'' (ماہنامہ اردو دنیا صفحہ 25 نئی دہلی ستمبر 2006ء)

احمد ندیم قاسمی نے مقامی سطح پر ہونے والے واقعات کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا۔ وہ اپنی بات کو ببانگ دُہل کہتے تھے۔ جب پاکستان کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہوگئے اور وہاں پر ایمرجنسی نافذ ہوگئی۔ اور انسانی حقوق کی پامالی سرِ عام کی گئی۔ تو ایسے سنگین اور نازک حالات و ماحول میں احمد ندیم قاسمی نے بہ ذریعہ قلم فوجی حکمرانوں کا مقابلہ کیا۔ ایک غیرت مند اور غیور ادیب ان پابندیوں کو کب تک برداشت کرتا۔ کیوں کہ احمد ندیم قاسمی نے قلم پر لگائی پابندی کو بہ ذات خود قد جھیلا تا حکومت وقت کے خلاف لکھنے پر وہ دو مرتبہ جیل جا چکے تھے۔ لیکن ان کا قلم ان ظلم کے خلاف اور انسانیت کی بقا اور وجود کے لئے بول اٹھا۔ بولنے سے مجھے کیوں روکتے ہو، بولنے دو کہ میرا بولنا دراصل گواہی ہے میرے ہونے کی، تم نہیں بولنے دو گے تو میں سناٹے کی بولی میں ہی بول اُٹھوں گا، میں تو بولوں گا، نہ بولوں گا تو مرجا اُں گا، بولنا تو صرف ہے میرا، کبھی اس نکتے پر بھی غور کیا ہے تم نے، کہ فرشتے بھی نہیں بولتے، میں بولتا ہوں، اگر چہ احمد ندیم قاسمی کے اصل شاعرانہ جوہر ان کی نظموں میں نظر آتے ہیں انہوں نے غزلیں بھی ایسی کہی ہیں جو اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کو جتنی مقبولیت شاعری میں تھی اُس نے کہیں زیادہ اُن کے افسانے بھی مقبول تھے۔ قاسمی صاحب کا اردو افسانہ نگاری میں منفرد مقام و مرتبہ ہے۔ اردو میں انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک افسانے تخلیق کئے۔ جو شاہکار کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے کئی افسانے کلاسیکل افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' رئیس خانہ'' ''گھر سے گھر تک'' ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد'' ''مامتا'' ''کپاس کا پھول'' پریمیشر سنگھ'' گنڈاسا'' سناٹا'' ''چوپال'' ''وحشی'' ''سلطان'' وغیرہ افسانے اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر دیہات کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پاکستان کے دیہاتی زندگی کے مسائل قاسمی صاحب نے مہذب طریقے سے قاری کے سامنے رکھا۔ اردو افسانہ نگاری میں پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت کے ساتھ ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگاری کی بدولت ہی انہیں ایک لیجینڈ کا درجہ دیا گیا۔ سید وقار عظیم نے احمد ندیم قاسمی کی فن نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

'' ندیم کی انفرادیت اور یگانگت بہ حیثیت انسان اور اس کی انفرادیت اور یگانگت بہ حیثیت فن کار، ترازو کے دونوں پلڑوں کو یوں ایک سطح پر لے آتی ہے کہ وہ انسان بھی عظیم تر ہی نظر آتا ہے اور فن کار بھی، اس کی وجہ میری اپنی نظر میں یہ ہے کہ ندیم جو باطن میں ہے وہ ظاہر میں بھی ہے اور جو اُس کا ظاہر ہے اس کا باطن بھی ہے۔ کوئی مجھ سے ندیم کے زیر بحث افسانوں کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گا ان کی کہانیاں زندگی کے زہر اور اس کے تریاق کی کہانیاں ہیں اور ان کی کہانیاں انسانیت اور فن کی بہترین قدروں کی غیر واعظاتی تلقین کی کہانیاں ہیں۔'' (ندیم کے افسانے سناٹا کے بعد صفحہ 270 اور 290 ندیم نامہ، (محمد طفیل اور بشیر موجد) لاہور پاکستان 1976ء) احمد ندیم قاسمی ایک نیک دل اور دردمند انسان تھے۔ اس بات کا علم ہمیں ان کے لکھے خطوط سے ہوتا ہے۔ ادبی رسائل و جرائد کی ادارت کرتے ہوئے ان کے تعلق دنیا بھر کے ادیبوں سے ہوگئے۔ ادیبوں کو خطوط لکھنا، پھر ان کے خطوط کا جواب دینا ادبی فرض کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری بھی تھی۔ ان خطوط میں قاسمی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ نئی نسل کو ادب میں روشناس کرانے میں ان کا اہم کردار رہا۔ جن ادبی شخصیتوں کے نام قاسمی صاحب نے خطوط تحریر کئے ان میں سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، عبادت بریلوی، شمس الرحمان فاروقی، مشفق خواجہ، خورشید رہا نیر، فتح محمد ملک، خواجہ عبیدہ الرحمٰن طارق، اختر شاہجہاں پوری اور رشید حسن خان کے اسماء سر فہرست ہیں۔ اپنی ان باتوں کی تصدیق کے لئے میں قاسمی صاحب کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی کا اعتراف نامہ تحریر کر رہا ہوں۔'' ندیم صاحب واقعی درویش صفت انسان تھے۔ وہ زندگی اور اُس کے حسن کے قدر دان تو تھے لیکن اُنہیں زیادہ کا حرص اور عیش و آرام کا لالچ نہیں تھا، جب کہ وہ ضروریات زندگی خود اپنے دستِ محنت سے پوری کر لیتے۔ وہ کبھی جھپٹتے نہیں تھے لیکن اپنا کچھ جھپٹنے نہیں دیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہا بانٹ دیا۔ وہ اُن کا قیمتی وقت ہی کیوں نہ تھا، کیوں کہ اُن کا پختہ یقین اس بات میں تھا کہ سکھ سب میں برابر تقسیم ہونا چاہیئں۔

(احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن ڈاکٹر ناہید قاسمی صفحہ 14 اکاڈمی ادبیات پاکستان اسلام آباد 2009ء) (بشکریہ ماہنامہ تریاق در بھنگہ بھارت)

افسانچے

دیپک بُدکی بھارت

آنکھوں کے لیے

کارتِک جب بھی اپنے ننھیال جاتا، نانا جی اسے بار بار یہی کہتے۔ ''بیٹے اب تم جوان ہو چکے ہو، نوکری بھی کرتے ہو، اب تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔'' نوکری من موافق نہ ہونے کے باعث کارتک ہر بار سنی ان سنی کر دیتا۔ آج نانا جی حد سے زیادہ جذباتی ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''بیٹے میں اسّی سال کا ہو چکا ہوں۔ نہ جانے کب آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ تم جلدی سے شادی کر لو تا کہ میری آنکھیں بھی دیکھ لیں۔'' کارتک کا موڈ ویسے ہی بہت خراب تھا۔ اس نے جس نوکری کے لیے درخواست دی تھی وہاں سفارش کے سبب کسی اور کی تقرری ہوئی تھی۔ اس لیے دوٹوک جواب دیا۔ ''نانا جی مجھے آپ کی آنکھوں کے لیے شادی نہیں کرنی ہے بلکہ اپنے لیے کرنی ہے۔ پھر آپ کیوں پریشاں ہوتے ہیں۔'' جواب سن کر نانا جی ہمیشہ کے لیے چُپ ہو گئے۔

زیورات کا ڈِبّہ

اپنی بہن کی شادی میں شریک ہو کر سمترا بریلی سے متھرا واپس آ گئی۔ گھر میں گھستے ہی وہ بسورنے لگی اور اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''میں لُٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ ٹرین میں میرا سب کچھ لُٹ گیا۔'' شوہر نے متانت سے استفسار کیا۔ ''کیا لُٹ گیا؟ بتاؤ تو سہی۔'' ''راستے میں کسی نے اٹیچی کیس سے میرے زیورات کا ڈِبّہ نکال لیا۔'' بریلی، کاس گنج، متھرا لائن ویسے بھی چوری ڈکیتی کے لیے بدنام ہے۔ اس پر اگر کوئی زیور لے کر سفر کرے، چوروں کی تو چاندی ہو گئی۔ شوہر نے کسی خاص جذباتی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ سرد مہری سے پوچھا۔ ''بچے کہاں ہیں؟''

''پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔'' ''دونوں ہیں...؟ گن کر لائی ہو۔''

''آپ کو تو ہر بات میں دل لگی سوجھتی ہے۔ کسی کا گھر جلے کوئی تاپے۔''

اتنی دیر میں دونوں بچے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ شوہر نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر گویا ہوا۔ ''جو ہوا سو ہوا۔ جاؤ، جا کر نہا لو۔ فریش ہو جاؤ گی۔''

''میری تو جان پر بن آئی ہے اور آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پتھر کا دل ہے آپ کا۔'' شوہر نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ البتہ دل میں سوچنے لگا۔ ''اگر اس نے چور کو دیکھا ہوتا اور مزاحمت کی ہوتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ عین ممکن تھا کہ چور خود کو بچانے کے لیے اس کی جان لے لیتا اور بچوں کو اغوا کر لیتا۔ پھر وہ نہ جانے اس وقت کہاں بھیک مانگ رہے ہوتے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ صرف زیورات چلے گئے، میرے لال تو بچ گئے۔'' مگر وہ یہ سب کچھ کہہ نہیں پایا۔

پوجا کا چندہ

وجے دشمی کے دن تھے۔ میں اگرتلا میں آرام سے گھر پر سو رہا تھا کہ صبح سویرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آنکھیں موندتے ہوئے پوچھا۔ ''کون...؟'' ''ہم ہیں سر... دروازہ کھولو۔ دُرگا پوجا کے لیے چندہ چاہیے''۔ باہر سے مقامی پوسٹل یونین کے جنرل سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ اس کے ہمراہ یونین کے تین اور آدمی تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ پھر خود بھی ان کے روبرو بیٹھ گیا۔ ''سر، دُرگا پوجا کے لیے کچھ چندہ دے دیجیے۔ اس سال تو ہم بہت بڑا پنڈال بنوا رہے ہیں۔'' ''کامریڈ چٹرجی، تم تو مارکس وادی کمیونسٹ ہو۔ اس ریاست کی سرکار بھی کمیونسٹ ہے۔ پھر یہ پوجا پنڈال کا کیا چکّر ہے؟'' مجھ سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس دیا اور پھر ایک ہزار روپے لے کر چل دیا۔

ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اب تک میرا بیٹا بھی جاگ چکا تھا۔ اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ ''انکل ہیں؟ ان سے کہہ دو کہ محلے میں پنڈال بنانے کے لیے چندہ چاہیے۔'' ایک لڑکے نے میرے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔ دریں اثنا میں

دروازے کے پاس آچکا تھا۔ محلے کے پانچ چھ لڑکے رسید بک لے کر دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے پانچ سو روپے نکال کر دے دیے اور رسید لے لی۔ میرا بیٹا حیرانگی سے مجھے تک رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے پوجا کے لیے چندہ دے دیا۔ آخر کار پوچھ بیٹھا۔ ''پاپا، آپ تو ناستک ہیں۔ دیوی دیوتاؤں پر یقین ہی نہیں کرتے، پھر اتنے سارے روپے کس لیے دیے؟''

''بیٹے یقین تو میں اب بھی نہیں کرتا ہوں پر انسان کبھی اجتماعی جبر کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ مانگنے والے کون سے دیوی بھگت ہیں۔ اس سے پہلے جو چندہ لے گئے وہ تو کمیونسٹ تھے اور یہ جو ابھی آئے تھے وہ سب محلے کے آوارہ لڑکے ہیں۔ اگر چندہ نہ دوں تو یہ لوگ کسی نہ کسی طریقے سے ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ کچھ نہیں تو تم لوگوں کو ہی پریشان کریں گے۔ ان کو بھی کہاں یہ سارے روپے دیوی کے پنڈال پر خرچ کرنے ہیں۔ تھوڑے بہت خرچ کر لیں گے، باقی جو روپے بچیں گے اس کی رات میں دارو پئیں گے۔ دیوی دیوتاؤں کا تو بس بہانہ ہے۔''

ہم سفر

ہم سفر یہ ضروری نہیں کہ دو مسافر ایک ہی راستے پر چل کر ایک دوسرے کے ہم سفر کہلائیں۔ اگر وہ اپنے سفر کی ابتدا دو الگ الگ وقتوں پر کرتے ہیں یا پھر دونوں کی رفتار میں فرق ہو تو وہ زیادہ دور تک ایک دوسرے کا ساتھ نہیں نبھا سکتے ہیں۔ کہیں پر ایک دوسرے سے ملنے کے باوجود تیز رفتار والا مسافر سبقت لے جائے گا جبکہ سست رفتار والا مسافر پیچھے رہ جائے گا۔ ایک ساتھ چلنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک ہی وقت پر ایک ہی سمت میں سفر شروع کریں اور یکساں رفتار سے چلیں یا پھر تیز رفتار والا اپنی رفتار کی قربانی دے کر دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرے۔

شفاء

''اے خدا! مجھے معاف کر۔ میں ان غریب، محتاج اور لاچار بیماروں سے اپنی روزی روٹی کما لیتا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے کیونکہ ڈاکٹری میرا پیشہ ہے اور زندہ رہنے کے لیے میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ البتہ اس بندے کی فریاد سُن لے۔ میرے ہاتھوں کو شفا بخش دے اور مجھے اس قابل بنا کہ میں حرص و ہوس سے پاک رہوں اور کسی کا استحصال نہ کروں۔''

نامے جو مرے نام آتے ہیں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ لکھتی ہیں:۔

مدیر ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

رانا عبدالرزاق خان سلام و آداب

میں آپ کی کاوشوں کی معترف ہوں، اس قدر دیدہ زیب، دلکش رسالہ آپ بہت مشقت و محنت سے نکالتے ہیں۔ جو کہ بے لوث بھی ہے اور ہر قسم کے لالچ سے مبرا۔ اور ہم سب کو سورج کی باقاعدگی کی طرح ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پہنچا بھی دیتے ہیں۔ میری غزلوں کو بھی اس میں جگہ دیتے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ آپ بلا تفریق سب کے مضامین و کلام شائع کرتے ہیں۔ امجد مرزا امجد بھی اسی طرح کرتے رہے ہیں۔ چار سال مکمل ہونے پر مبارکباد قبول کریں۔

میری دعا آپ کے لئے اور آپ کی ساری ٹیم کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قندیل کو ہمیشہ روشن رکھے آمین۔

جلی حروف میں ہاتھ سے لکھی ہوئی اس تحریر پر کالا فریم چڑھا ہوا ہے اور ڈاکٹر رحیم الدین کی کرسی کے ٹھیک پیچھے دیوار پر لٹک رہی ہے۔ یہ تحریر اسے ہمیشہ یاد دلاتی ہے کہ ایک ڈاکٹر کی زندگی کا منصب صرف انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔ بعض اوقات وہ غریب مریضوں کی فیس معاف کرتا ہے یہاں تک کہ مفلس بے سہارا عورتوں کو گھر واپس جانے کے لیے اپنی جیب سے خرچہ بھی دے دیتا ہے۔

انجام کار ڈاکٹر رحیم الدین کا کلنک آج بھی ویسا ہی ہے جیسا وہ تیس سال پہلے تھا جبکہ اس کے ہم پیشہ ڈاکٹروں نے کروڑوں کی جائیدادیں بنالی ہیں۔ ڈاکٹر رحیم الدین کے بچوں نے بیوقوف اور نالائق سمجھ کر اسے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے، بیٹی بیاہ کر کے سسرال چلی گئی اور دونوں بیٹے امریکا جا کر بس چکے ہیں۔ اس کے باوجود وہ تنہائی سے نہیں گھبراتا۔ اسّی سال کی عمر میں بھی وہ صبح سویرے جاگتا ہے، مسجد جا کر شکرانے کی نماز پڑھتا ہے، اپنے ذاتی کام خود کرتا ہے اور پھر اپنے مطب میں پورے عزم و استقلال سے دن بھر اپنے پاؤں پر کھڑا مریضوں کے آنسو پونچھتا ہے۔

-

حاصل مطالعہ

عاصی صحرائی

اپنے لہجے کا ہر وقت خیال رکھیں

ایک بار جناب حضرت بہلول دانا کسی نخلستان میں تھے کہ ایک تاجر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ آپ کے پاس ادب سے بیٹھ گیا۔ اور بہت ادب سے گزارش کی کہ حضور کوئی مشورہ دیں۔ کون سی ایسی جنس خریدوں کہ جس میں بہت منافع ہو۔ جناب بہلول دانا نے فرمایا کہ سیاہ کپڑا خرید لو۔ اس تاجر نے شہر کا سارا سیاہ کپڑا خرید لیا۔ چند دنوں کے بعد شہر کا ایک رئیس وفات پا گیا۔ لوگوں نے سیاہ کپڑے اوڑھنے کے لئے بہت کپڑا خریدا۔ اس تاجر نے منہ مانگے دام کمائے اور بہت منافع کمایا۔ شہر کا بہت بڑا تاجر بن گیا۔ ایک دن کسی جگہ سے تاجر کا گھوڑے پر سوار گزر ہوا تو اس کی نظر جناب بہلول دانا پر پڑی۔ کہنے لگا اے دیوانے بتا اب کی بار کیا خریدوں۔ جناب بہلول دانا نے فرمایا کہ تربوز خرید لے۔ لہٰذا اس نے سارے شہر کے تربوز خرید لئے۔ وہ سارے ایک ہفتہ کے بعد گل سڑ گئے۔ تاجر کوڑی کوڑی کو ترس گیا۔ ایک دن پھر راستے میں جناب بہلول دانا سے مڈبھیڑ ہوئی تو کہنے لگا۔ کہ اے حضرت آپ نے مجھ سے کیا کیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ میرا نہیں تیرے لہجے، لفظوں کا قصور تھا۔ لہٰذا گزارش ہے کہ اپنے لہجوں کا خیال رکھیئے اور نرم اور خلیق زبان کا استعمال کیجیئے۔ پرندے اپنے پاؤں سے انسان اپنی زبان سے جال میں پھنستے ہیں۔

کبھی کسی اندھے کا مذاق نہ کریں

ایک اندھا آدمی ایک فائیو سٹار ہوٹل میں گیا! ہوٹل منیجر نے اس سے پوچھا: یہ ہمارا مینو ہے، آپ کیا لیں گے سر؟

اندھا آدمی: میں اندھا ہوں، آپ مجھے اپنے کچن سے، چمچہ کو کھانے کے اشیاء میں ڈبو کر لا دیں، میں اسے سونگھ کر، آرڈر کر دوں گا! منیجر کو یہ سن کر بڑی حیرانی ہوئی، اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ، کوئی آدمی سونگھ کر کیسے بتا سکتا ہے کہ ہم نے آج کیا بنایا ہے، کیا پکایا ہے! منیجر نے جتنی بار بھی، اپنے الگ الگ کھانے کی اشیاء میں، چمچہ ڈبو کر، اندھے آدمی کو سنگھایا، اندھے نے صحیح بتایا کہ وہ کیا ہے، اور اندھے نے سونگھ کر ہی کھانے کا آرڈر کیا!! ہفتے بھر یہی چلتا رہا..... اندھا سونگھ کر، آرڈر دیتا اور کھانا کھا کر چلا جاتا! ایک دن منیجر نے، اندھے آدمی کی امتحان لینے کی سوچی کہ یہ ایک اندھا آدمی سونگھ کر کس طرح بتا سکتا ہے؟ منیجر کچن میں گیا اور اپنی بیوی حنا سے بولا کہ، تم چمچہ کو اپنے ہونٹوں سے گیلا کر دو! حنا نے چائے کے چمچے کو اپنے ہونٹوں پر رگڑ کر منیجر کو دے دیا۔ منیجر نے وہ چائے کا چمچہ اندھے آدمی کو لے جا کر دیا اور بولا، بتاؤ آج ہم نے کیا بنایا ہے؟ اندھے آدمی نے چمچہ کو سونگھا اور بولا:

اوہ مائی گاڈ۔ میری کلاسمیٹ حنا یہاں کام کرتی ہے۔

منیجر... بیہوش

حاجتیں پوری کریں گے کیا تری عاجز بشر
کر بیاں سب حاجتیں حاجت روا کے سامنے

جناب داؤد طائی رحمۃ الہہ علیہ سے منسوب ایک حکایت ہے کہ ان کے شہر میں ایک عورت بیوہ کیا ہوئی کہ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بچوں کے ساتھ کل جمع پونجی بس تین درہم۔ حالات سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور جا کر بازار سے ان تین درہم کا اُون خرید لائی کچھ چیزیں بنا کر فروخت کیں تو پانچ درہم وصول پائے۔ دو درہم سے کھانا پینا خریدا اور تین درہم کا پھر سے اُون خرید لائی۔ اس طرح کچھ دنوں تک گزر بسر کیا ایک دن بازار سے کھانا پینا اور اُون لے کر گھر کو لوٹی اُون رکھ کر بچوں کو کھانا پینا دینے لگی کہ ایک پرندہ کہیں سے اُڑتا ہوا آیا اور اُون اٹھا کر لے گیا۔ عورت کے لئے اپنی کل کائنات کا یوں لٹ جانا سوہان رُوح تھا۔ مستقبل کی پریشانیوں سے خوف زدہ غم و غصہ سے پاگل کی مانند ہو گئی۔

دوسرے دن سیدھا جناب داؤد کے گھر گئی اور اُن کو سارا قصہ سنا کر ایک سوال پوچھا کیا ہمارا رب رحم دل ہے یا ظالم؟ جناب داؤد طائی عورت

کی دردبھری کہانی سن کر پریشانی کے عالم میں کوئی جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جاکر دیکھا تو دس اجنبی اشخاص کو کھڑے ہوئے پایا،اُن سے آنے کا مقصداور ماجراپوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہم سمندر میں سفرکررہے تھے کہ ہماری کشتی میں ایک سوراخ ہوگیا۔ پانی اس تیزی سے بھر رہا تھا کہ ہمیں ہماری موت نظر آرہی تھی مصیبت کی اس گھڑی میں ہم سب نے عہد کیا کہ اگر اللہ پاک ہماری جان بچا دیتے ہیں تو ہم میں سے ہر آدمی ایک ہزار درہم صدقہ کرے گا۔ابھی ہم یہ دعا کررہے تھے کہ ایک پرندے نے ہماری کشتی میں اُون کا ایک گولہ لا کر پھینک دیا۔ جسے ہم نے فوراً سوراخ میں پھنسا دیا۔کشتی کو پانی سے خالی کیا اور فوراً نزدیک ترین ساحل پر یہاں آ پہنچے۔ہم چونکہ یہاں کے لئے اجنبی تھے اس لئے یہاں کسی معتبر آدمی کا نام پوچھا اور انہوں نے ہمیں سیدھے آپ کے پاس بھیج دیا یہ لیجئے دس ہزار درہم اور ہماری طرف سے مستحقین کو دے دیجئے۔

داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ دس ہزار درہم لے کر سیدھا اندر اس عورت کے پاس گئے۔سارے پیسے اُس عورت کو دے دئے اور کہا اب میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تیرا رب رحم دل ہے یا ظالم؟(سبحان اللہ بیشک اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔اور وہی ہے جو برے حالات میں ہمارا سب سے بہترین دوست ہے۔

واسکوڈے گاما Vasco De Gama

پرتگال کا مہم جو اور جہاز ران جس نے ۱۴۹۷ء میں ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔رئیس گھرانے میں پیدا ہوا۔نوجوانی ہی میں اس قدر شہرت حاصل کر لی کہ شاہ پرتگال نے دربار میں طلب کر کے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کا حکم دیا۔۸ جولائی ۱۴۹۷ء کو وہ اس کٹھن مہم پر روانہ ہوا۔اور چند ماہ کے بعد ہندوستان کے جنوبی مغربی ساحل پر کالی کٹ شہر میں اُترا۔اس کامیابی پر بادشاہ نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔اور امیرالبحر کے خطاب سے نوازا۔۱۵۰۲ء میں اس نے ہندوستان کا ایک بحری سفر کیا۔۱۵۲۴ء میں اسے ہندوستان میں پرتگالی مقبوضات کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔مگر آمد کے بعد ہی دو ماہ میں انتقال کر گیا۔

نیٹ بال Netball

باسکٹ بال کی طرح کا کھیل ہے باسکٹ بال کو مردوں کا کھیل ہے لیکن لڑکیاں بھی کھیلتی ہیں۔اس کے برعکس نیٹ بال عام طور پر لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے۔باسکٹ بال کی طرح یہ کھیل بھی باہر میدان میں کھیلا جاتا ہے۔گیند بھی اسی طرح کی ہوتی ہے۔اور گول کرنے کا طریقہ بھی وہی ہے۔لیکن اس میں عقبی بورڈ نہیں ہوتے۔نیٹ بال میں پانچ کی بجائے سات کھلاڑی کھیلتے ہیں۔اور متبادل کھلاڑیوں کی اجازت نہیں ہوتی۔اس کا کورٹ ۵۔۳۰ میٹر یا ۱۰۰ فٹ لمبا اور ۲۵۔۱۵ میٹر یا ۵۰ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔اور گول پوسٹ ۱۰ فٹ اونچی ہوتی ہے۔

دنیا کے دس بڑے کتب خانے

۱۔لائبریری آف کانگریس۔امریکا کے دارالحکومت میں واقع لائبریری 1800ء میں قائم ہوئی۔اس میں ۲۹ ملین کتب کا ذخیرہ ہے۔۲۔نیشنل لائبریری آف چائنا۔چین کے دارالحکومت میں قائم یہ لائبریری دنیا کی دوسری بڑی لائبریری ہے۔اس میں ۲۲ ملین کتب ہیں اور یہ ۱۹۰۹ء میں قائم ہوئی ۔ ۳۔لائبریری آف رشین اکیڈمی آف سائنسز۔سینٹ پیٹرس برگ۔روس میں واقع یہ لائبریری ۱۷۱۴ء میں تعمیر ہوئی۔اس میں ۲۰ ملین کتب موجود ہیں۔۴۔نیشنل لائبریری آف کینیڈا۔کنیڈا کی نیشنل لائبریری ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی۔اس میں ۸۔۱۸ ملین کتب موجود ہیں۔۵۔جرمن نیشنل لائبریری۔فرینکفرٹ جرمنی میں واقع اس لائبریری میں ۵۔۱۸ ملین کتب موجود ہیں۔یہ ۱۹۹۰ء میں قائم ہوئی۔۶۔برٹش لائبریری۔لندن میں واقع اس لائبریری میں ۱۶ ملین کتب کا ذخیرہ ہے۔۱۷۵۳ء میں قائم ہوئی۔۷۔رشین اکیڈمی آف سائنسز۔ماسکو کی اس لائبریری ۵ؤ ۱۴ ملین کتب موجود ہیں اور ۱۹۶۹ء میں قائم ہوئی ۔۸۔ہارورڈ یونیورسٹی لائبریری یہ لائبریری ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی۔ اس میں ۱۔۱۳ ملین کتب موجود ہیں۔۹۔ورناتسکی نیشنل سائنٹیفک لائبریری۔اس لائبریری میں ۱۳ ملین کتب ہیں۔یہ ۱۹۱۹ء میں تعمیر ہوئی۔۱۰۔نیویارک پبلک لائبریری۔اس میں ۱۱ ملین ہے۔یہ ۱۸۹۵ء میں تعمیر کی گئی۔

(سنڈے ایکسپریس ۲۵ مارچ ۲۰۰۷ء)

جستہ جستہ

فراز حمید خاں

جس پہلا جہاز کے مالک شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز السعود ہیں۔ جس کی مالیت ۷۳ ملین ڈالرز امریکی ہے۔ یہ جہاز ۱۹۸۴ء میں بنا۔اس میں ۲۲ مہمانوں کے علاوہ ۱۴ مزید افراد پر مشتمل سٹاف کی جگہ بھی ہے۔اس میں ایک ریسٹورنٹ بھی ہے۔

دوسرا جہاز جس کے مالک شیخ راشد المختوم ہیں۔اس کی مالیت ۳۰۰ ملین ڈالرز ہے۔اس میں ایک ہیلی پیڈ، کشادہ ڈائننگ ہال، وی آئی پی کمرے موجود ہیں اور فل ائر کنڈیشنڈ ہے۔تیسرا جہاز جس کے مالک سلطان قابوس ہیں۔اس کی مالیت ۱۰۹ بلین ڈالرز ہے اس میں ۶۵ مہمانوں اور ۴۰ سٹاف ممبرز کی جگہ موجود ہے۔

چوتھا جہاز جس کے مالک الولید بن طلال السعود ہیں۔اس کی مالیت ۴۰۰ سو ملین یورو ہے اس کی رفتار ۳۵ میل فی گھنٹہ ہے ابھی یہ زیر تعمیر ہے اور اس کی تمام خصوصیات کو خفیہ رکھا جا رہا ہے۔ پانچواں جہاز جس کا مالک بھارتی بزنس مین انیل اصبانی ہیں اس کی مالیت ۸۰ ملین ڈالرز ہے اس میں کلاسیکل ایریا، پانچ کیبن ہیں۔ چھٹا بحری جہاز جس کے مالک لکشمی متل ہیں۔اس میں سوئمنگ پول ایک سیلون اور ۱۶ مہمانوں کے ساتھ ۲۲ سٹاف ممبرز کی جگہ موجود ہے۔(روزنامہ جنگ ۲۴ مئی ۲۰۱۳ء)

جن لوگوں نے خدا سے ٹھٹھا کیا اُن کا انجام

۱۔صدر برازیل Tancredo Neves نے اپنی الیکشن مہم کے دوران کہا اگر مجھے پانچ لاکھ ووٹ مل گئے تو تو خدا بھی مجھے صدارت سے محروم نہیں کرسکتا۔اس نے ووٹ حاصل کئے مگر ایک دن پہلے ہی صدر بننے سے وہ اس دنیا سے چل بسا۔

۲۔CAZUZA جو کہ برازیل کا شاعر اور سنگر تھا۔ایک دن تکبر میں شو کے دوران اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور منہ سے نفرت سے ایک دھوئیں کی لہر نکالی اور کہا ”یہ خدا کے لئے ہے“۔وہ بہت ہی جلد ۳۲ سال کی عمر میں پھیپھڑوں کے کینسر سے ہلاک ہوگیا۔

۳۔ٹائٹینک بنانے والے سے جب ایک رپورٹر نے پوچھا کہ ”بتائیں آپ کا یہ بنایا ہوا جہاز کتنا مضبوط اور سیف ہے؟

اُس نے بڑے غرور سے جواب دیا کہ اس پر کئی ٹن لوہا لگایا گیا ہے“ اب تو تو خدا بھی اسے نہیں ڈبو سکتا“۔مگر ساری دنیا نے دیکھا کہ اس جہاز کا کیا انجام ہوا۔بہت جلد ہی وہ ڈوب گیا۔ہمارا خدا ایک زندہ خدا ہے۔

سلیقہء گفتار

کوفہ کے باشندوں نے مامون الرشید کے پاس گورنر کی شکایت کی اور کہا کہ اس کا تبادلہ کردیں۔ماموں نے حیران ہوکر کہا۔میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی عادل اور راست باز کوئی نہیں ہے۔اس پر ایک شخص بولا کہ اے امیر المومنین اگر ہمارا گورنر ایسا ہی ہے تو آپ کو سارے ملک سے انصاف کرنا چاہیئے۔اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے اس کو ہر شہر کو مستفید کرنا چاہیئے۔اگر ایسا کریں تو پھر بھی کوفے کے حصے میں تین سال سے زیادہ نہیں آئیں گے۔ماموں اس بات پر ہنس پڑا اور گورنر کا تبادلہ کردیا۔

وُسعت اللہ خان

آج کانڈھال، کنفیوزڈ، ڈرا، سہما پاکستان دراصل گیارہ اگست کی تقریر اور قراردادِ مقاصد سے جبری پیدا ہونے والا بچہ ہے۔یہ شادی یونہی رہی تو یہ طفل مظلوم کہیں کا نہیں رہے گا۔

نسیم جاوید (دانشور، ادیب، مصنف، ڈرامہ نویس)

عربوں کی جہالت جس طرح اسلام سے قبل موجود تھی آج کل بھی اسی طرح موجود ہے۔سعودی عرب میں نہ کوئی تحقیقی ادارہ ہے اور نہ کوئی سائنسی ترقی کا نام ونشان۔حتیٰ کہ تیل نکالنے اور اس کی صفائی تک کے لئے سعودی عرب امریکیوں کے محتاج ہیں۔عربوں کی تاریخ، دشمنیوں، جنگوں اور جہالت سے بھرپور ہے اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اس تاریخ کو اپنا نہ صرف اپنا عقیدہ بنالیا ہے بلکہ عربوں کی غلامی کو اپنا دین

سمجھ بیٹھے ہیں۔

انصاف کون کرے گا

بجٹ میں ملازمین کی تنخواہ ستر فیصد بڑھائی گئی تھی۔ پارلیمنٹیرین کی بغیر بجٹ کے ستر ہزار سے سیدھی دو لاکھ بڑھا دی گئی۔ یہ نظرِ کرم سرکاری ملازمین پر پوری زندگی میں ایک بار بھی نہیں ہوا۔نوکری تیس سال اور تنخواہ پیدرہ ہزار۔اس ناانصافی پر کوئی عدالت ممکن ہے۔بالکل نہیں۔

ابنِ انشاء اور اونٹ

اونٹ ایک جانور ہے۔اکبرالہٰ آبادی نے اسے مسلمان سے تشبیہ دی ہے۔کیونکہ مسلمان کی طرح اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی اور مسلمان کیطرح یہ بھی صحرا کا جانور ہے۔بہت دن تک یہ کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے جس طرح ہر مسلمان کی پیٹھ پر عظمتِ رفتہ کا ایک کوہان ہوتا ہے،اس کی پیٹھ پر بھی ہوتا ہے۔مت پوچھ مسلمان کا حال۔مسجد کے لئے سر کٹانے کو تیار ہے لیکن مسجد میں سر جھکانے کے لئے نہیں۔حضرت نبی ﷺ کا نام سنتے ہی جھوم جاتے ہیں اور اُن کا حکم (نماز روزہ) سنتے ہی گھوم جاتے ہیں۔کہتے ہیں کہ میرے رگ رگ میں نبی نبی مگر نماز پڑھتے ہیں سال میں کبھی کبھی۔

کامیاب لوگ

Albert Aynstyn

اسکول کی باسکٹ بال ٹیم سے نکالا گیا، گھر آ کر خود کو کمرے میں لاک کیا اور گھنٹوں روتا رہا بعد میں وہی لڑکا چھے بار کا باسکٹ بال چیمپئین ''مائیکل جارڈن'' بنا۔چار سال کی عمر تک اس کے والدین یہی سوچتے رہے وہ گونگا ہے چار سال کی عمر میں وہ پہلی بار بولا۔اس کے والدین کو ہمیشہ اس کی فکر ہوتی تھی کہ یہ اس دنیا میں کیسے سروائیو کرے گا وہی بچہ ''البرٹ آئن اسٹائن'' بنا۔

Operanafray

بطور نیوز اینکر جاب سے نکال دیا گیا کیوں کہ بقول مالکان کے، وہ ٹیلی ویژن پر اچھی نہیں لگتی فٹ نہیں بیٹھتی...بعد میں وہی عورت ''اوپرا ونفرے'' بنی جس پچھی صدی کی طاقتور ترین خاتون کہا جاتا تھا جو کہ متعدد ایوارڈ ونرٹا لک شو کی اینکر رہی ہیں۔

woltdizney

اخباری نوکری سے یہ کہہ کر نکال دیا گیا کہ آپ کے پاس کوئی تخلیقی صلاحیت نہیں ہے کوئی اوریجنل آئیڈیاز نہیں ہیں وہی شخص بعد میں "والٹ ڈزنی" بنا جو کہ مکی ماوس نامی کرداروں کا بنانے والا ہے۔

liunalmessy

گیارہ سال کی عمر میں ٹیم سے نکال دیا گیا کیوں کہ وہ ایک ایسی بیماری کا شکار تھا جس کے تحت انسان کا قد بڑھنا رک جاتا ہے وہ اپنی عمر کے بچوں سے بہت چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔معاشرے بھر میں اس کا مذاق بنایا جاتا تھا وہی لڑکا آج مشہور فٹ بالر ''لیونل میسی'' ہے۔

Astewsjabz

تیس سال کی عمر میں اسے تباہ شدہ حال میں تنہا چھوڑ دیا گیا...اسی اس کے شیئر ہولڈرز نے اسی کمپنی سے نکال دیا جسے اس نے خود بنایا تھا...وہی شخص بعد میں دنیا کو ٹچ اسکرین ٹیکنالوجی سے آشنا کر گیا اور دنیا اسے ایپل کے بانی 'اسٹیو جابز' کے نام سے جانتی ہے۔

Repera amanium

ہائی اسکول سے نکالا گیا۔نشے نے اتنا برباد کر دیا تھا کہ کئی بار خودکشی کی ناکام کوشش کی۔۔آج وہی لڑکا دنیا کا مشہور ترین سنگر اور ریپر 'ایمینم' کہلاتا ہے۔

Thomas adison

استاد نے اسے یہ کہہ کر اسکول سے نکال دیا کہ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تم ایک نہایت کند ذہن بچے ہو۔وہی کند ذہن بچہ بعد میں الیکٹرک بلب سمیت ایک ہزار سے زیادہ ایجادات کا مالک بنا جسے ہم "تھامس ایڈیسن کہتے ہیں۔

Dabetlz

ڈیکا ریکارڈنگ اسٹوڈیو نے یہ کہہ کر نکال دیا کہ ہمیں آپ کے گانے پسند نہیں آئے اس فیلڈ میں آپ کا کوئی فیوچر نہیں جاؤ کوئی اور کام کرو بعد میں وہی بینڈ میوزک کی تاریخ کا سب سے مشہور بینڈ 'دا بیٹلز' کہلایا۔

Dr.SES۔ان کی پہلی کتاب ستائیس پبلشرز نے مسترد کر دی اور چھاپنے سے انکار کر دیا۔بعد میں ''ڈاکٹر سیس'' انگلش ادب کی تاریخ میں بچوں کے پڑھے جانے والے سب سے کامیاب مصنف بنے۔

Ibraham linkolin

منگیتر کی موت ہوگئی، بزنس ناکام ہوگیا، نروس بریک ڈاون ہوگیا اس کے علاوہ آٹھ الیکشن میں شکست ہوئی لیکن وہی شخص بعد میں امریکہ کا سولہواں صدر بنا جسے دنیا 'ابراہم لنکن' کے نام سے جانتی ہے۔

Owner Honda car

ٹویوٹا کمپنی میں بطور آٹو موبائل انجینئر کی جانب کے لیے انٹرویو دینے گیا اور ناکام رہا۔جسے ٹویوٹا کمپنی نے جاب دینے سے انکار کر دیا آج وہی شخص ہنڈا کمپنی کا مالک ہے۔یاد رکھیں اگر آپ کبھی ناکام نہیں ہوئے تو اس کا مطلب ہے آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی...

ایک اُستاد

ایک استاد تھا وہ اکثر اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ دین بڑا قیمتی ہے۔ایک روز ایک طالب علم کا جوتا پھٹ گیا۔وہ موچی کے پاس گیا اور کہا: میرا جوتا مرمت کر دو۔اس کے بدلہ میں، میں تمہیں دین کا ایک مسئلہ بتاؤں گا۔موچی نے کہا: اپنا مسئلہ رکھ اپنے پاس۔ مجھے پیسے دے۔طالبِ علم نے کہا: میرے پاس پیسے تو نہیں ہیں موچی کسی صورت نہ مانا۔اور بغیر پیسے کے جوتا مرمت نہ کیا۔طالبِ علم اپنے استاد کے پاس گیا اور سارا واقعہ سُنا کر کہا: لوگوں کے نزدیک دین کی قیمت کچھ بھی نہیں۔استاد عقل مند تھے: طالبِ علم سے کہا: اچھا تم ایسا کرو: میں تمہیں ایک موتی دیتا ہوں تم سبزی منڈی جا کر اس کی قیمت معلوم کرو۔وہ طالبِ علم موتی لے کر سبزی منڈی پہنچا اور ایک سبزی فروش سے کہا: اس موتی کی قیمت لگاؤ۔اس نے کہا کہ تم اس کے بدلے یہاں سے دو تین لیموں اُٹھا لو۔اس موتی سے میرے بچے کھیلیں گے۔وہ بچہ استاد کے پاس آیا اور کہا: اس موتی کی قیمت دو یا تین لیموں ہے۔استاد نے کہا: اچھا اب تم اس کی قیمت سُنار سے معلوم کرو۔وہ گیا اور پہلی ہی دکان پر جب اس نے موتی دکھایا تو دکان دار حیران رہ گیا۔اس نے کہا اگر تم میری پوری دکان بھی لے لو تو بھی اس موتی کی قیمت پوری نہ ہوگی۔طالبِ علم نے اپنے استاد کے پاس آ کر ماجرا سُنایا۔ استاد نے کہا: بچے! ہر چیز کی قیمت اس کی منڈی میں لگتی ہے۔دین کی قیمت اللہ کی منڈی میں لگتی ہے۔اس قیمت کو اہلِ علم ہی سمجھتے ہیں۔جاہل کیا جانے دین کی قیمت کیا ہے۔

خوشی کے پھول

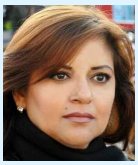

فرزانہ نیناں

گھنے پیڑوں کے چھاؤں میں جہاں وہ چاند رہتا تھا
جہاں پر خواب نیلی چاندنی میں رقص کرتے تھے
جہاں تم میری آنکھوں میں سویرے کو بچھاتے تھے
وہیں اب آنے والی تتلیوں کے پر بکھرتے ہیں
وہیں اُڑتے ہوئے پنچھی عجب سی
بانوری دُھن میں ٹھٹھک کر رُکنے لگتے ہیں
دُھواں اُٹھتا ہے اُس گھر سے
میں اب بھی جس کی پہلی اینٹ کا گارا بناتی ہوں
میں اپنی راکھ میں چہرے لئے آنسو ملاتی ہوں
نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں مگر یہ کون دیکھے گا..!
ہوا کے جھونکے جب مجھ کو کوئی آہٹ سناتے ہیں
میں غالیچہ بچھاتی ہوں سلگتے ہجر کی رَہ پر
تمہاری خوش اُمیدی کا، کئی صدیوں میں
جب وہ ایک لمحہ لوٹ آئے گا
مجھے اُجلے ستاروں سے سجاؤ گے ہتھیلی پر
مجھے جس روز اپنے ہاتھ سے لکھو گے پتھر پر
میں تم کو ریت پر لکھنے، ہوا کے ساتھ جاؤں گی
خوشی کے سُرخ پھولوں کو میں جا کر نوچ آؤں گی

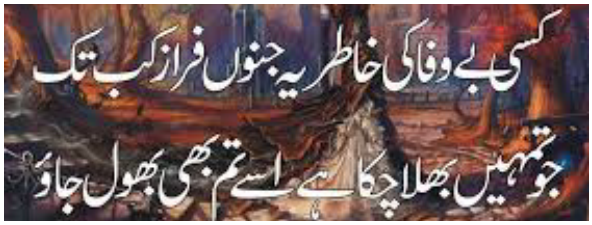

افسانہ

عذرا ناز ریڈنگ

بھرم

بھوک سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اپنے گھر کے اندر داخل ہو کر امی کے ہاتھ کا بنا ہوا لذیز کھانا کھانے کی خواہش سے بیتاب جلد سے جلد گھر میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ آج سارا دن کالج میں بھی کچھ کھانے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اب بھوک کے ساتھ ساتھ تھکن کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں آج امی جان نے کیا پکایا ہوگا؟ یہی سوچتی ہوئی میں گیٹ کے اندر داخل ہوئی اور ابھی اندرونی دروازہ کھول کر کوریڈور میں داخل ہوئی ہی تھی کہ ایک بے ہنگم نسوانی قہقہے نے میرے قدم روک دیئے۔ یا خدا یہ کس مہمان کا نزول ہوا ہے جس کی فلک شگاف ہنسی کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ عجیب مجنونانہ ہنسی تھی۔ میں نے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے کچن میں جھانکا۔ تبھی میرے نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ پھولا پھولا سا سرخ و سفید ادھیڑ عمر کا چہرہ میرے سامنے آیا۔ وہ کالے رنگ کی سفید اور سرخ پھولوں والی قمیض اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھی۔

دوپٹے سے بے نیاز سفید بالوں والا سر کہیں کہیں کالے بالوں کی جھلک بھی لئے ہوئے تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس کی آنکھوں میں بچوں کی سی شرارت اور سرگوشی بھری ہوئی تھی۔ ہنستے ہوئے اس کے گالوں میں بھنور پڑتے تھے اور دکھنے میں بالکل سانتا کلاز جیسی لگتی تھی۔ امی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ آہا میری بیٹی کالج سے آ گئی؟ ارے تم نے خالہ کو نہیں پہچانا؟ انھوں نے پوچھا۔ میری آنکھوں میں تیرتی اُلجھن کو دیکھ کر امی جان نے میری یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے بتایا یہ خالہ شاہ بیگم تھیں۔ بچپن میں وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھیں اور انھوں نے مجھے گود میں کھلایا تھا۔ میں تھوڑی سی خجل ہوئی۔ سوری امی مجھے یاد نہیں ہے۔ میں شرمندہ ہوتی ہوئی بولی۔ ارے کوئی بات نہیں بچی ہے کہاں یاد رہا ہوگا اس کو بلقیس۔ ویسے بھی میں بہت مدت بعد آئی ہوں نا! خالہ شاہ بیگم نے کہا۔ ہوں یہ بات تو ہے۔ امی جان نے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ ارے تم جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ میں کھانا لگاتی ہوں۔ امی نے کہا۔ میں چپ چاپ واش رُوم میں چلی گئی۔ واپس آئی تو امی کھانا لگا چکی تھیں۔ اچھا نمرہ تم کھانا کھالو میں ذرا شاہ بیگم کے ساتھ بیٹھتی ہوں اتنے سالوں بعد ملی ہے تو ذرا اس کا حال احوال معلوم کر لوں۔ امی جان نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ کھانا کھا کر میں نے نماز پڑھی اور پھر سوچا تھوڑی دیر آرام کر لوں پھر اپنی اسائنمنٹ مکمل کر لوں گی۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کب میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو مغرب کا وقت ہونے کو تھا۔ میں نے اُٹھ کر جلدی جلدی غسل کیا اور پھر مغرب کی نماز ادا کر کے ہال میں چلی آئی۔ امی جان خالہ شاہ بیگم کے ساتھ بیٹھی کسی بات پر ہنس رہی تھیں اور خالہ شاہ بیگم کی ہنسی؟۔ اُف اُن کی ہنسی سے تو مجھے خوف آنے لگا تھا۔

چائے بنا لوں امی؟ میں نے پوچھا۔ ارے نہیں چائے تو ہم لوگ ابھی ابھی پی کر بیٹھے ہیں۔ امی آج رات کے کھانے میں کیا بناؤں؟ میں نے پوچھا۔ کچھ نہیں میں نے رات کے کھانے کا انتظام کر لیا ہے۔ ایسا کرو تم اپنے لئے چائے بنا لو۔ امی نے کہا۔ ٹھیک ہے امی۔ میں نے جواب دیا اور کچن میں چل دی۔ چائے کا کپ لے کر میں اپنے کمرے میں ہی چلی آئی، اسائنمنٹ جو مکمل کرنی تھی۔ کام مکمل کر کے میں نے ٹی وی آن کر لیا۔ جیو چینل پر میرا پسندیدہ ڈرامہ نورِ زندگی شروع ہونے والا تھا۔ میں بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھی کہ سدرا، کے لئے بلانے چلی آئی۔ نہیں سدرا میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔ تم لوگ کھا لو میں بعد میں کچھ ہلکا پھلکا سا کھا لوں گی۔ میں نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے باجی۔ اس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ ماسی شاہ نور کچھ دنوں بعد واپس چلی گئی تھی۔ لیکن اب وہ اکثر ہی ہمارے گھر آنے لگی۔ کبھی چند ہفتوں کے لئے اور کبھی مہینوں تک کا قیام ہوتا۔ ایک بات مجھے بڑی متاثر کن لگی کہ امی اس عورت کی بے حد عزت کرتی تھیں اور اس کی ہر ضرورت کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ وہ جتنے دن ہمارے گھر میں رہتی امی کھانے پینے میں بہت اہتمام کرتیں۔ اور جاتے ہوئے وہ بے شمار تحفے لے کر جاتی۔ امی جان اس کو نئے کپڑے بھی بنوا کر دیتی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ امی جان سے بالکل مختلف تھی پھر بھی امی نے اس تضاد کو اپنے اور اس کے بیچ کبھی بھی نہیں آنے دیا۔ امی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں جبکہ ماسی شاہ نور ایک اَن پڑھ اور عام سی خاتون تھی۔ وہ بہت اُونچے لہجے میں بات کرنے کی عادی تھی اور کبھی کبھی بچگانہ انداز میں ضد بھی کرتی تھی۔ جیسے ایک بار اس نے ضد پکڑ لی

تھی کہ وہ اپنی پسند کے کمرے میں قیام کریں گی اور وہ کمرہ میری چھوٹی بہن کا تھا۔میری چھوٹی بہن بہت جز بُز ہوئی مگر امی جان نے اسے کسی نہ کسی طرح سے منا لیا اور وہ کمرہ اسے دے دیا گیا اور میری بہن چند ہفتوں کے لئے چھوٹے کمرے میں منتقل ہو گئی۔اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔کبھی کبھی مجھے غصہ بھی آ جاتا تھا کہ آخر اس عورت کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارے گھر میں آ کر اتنی دھونس جمائے مگر امی ہمیشہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ وہ یہاں چند روز کے لئے مہمان ہے اس لئے ہمیں آدابِ میزبانی کا احترام کرنا چاہیئے، کہہ کر ہمیں قائل کر لیتیں۔اور ہم خاموشی اختیار کر لیتے۔جب وہ چلی جاتی تو ہمیں بہت اچھا لگتا۔لیکن ہر چند ماہ کے بعد وہ چلی آتی تھی۔پھر یوں ہوا کہ اس کے آنے کا وقفہ طول پکڑتا گیا۔امی اکثر اسے خط لکھ کر اس کی خیریت معلوم کر لیا کرتی تھیں۔پتہ نہیں وہ کس سے خط پڑھواتی اور لکھواتی ہوگی کیونکہ خود تو وہ کوری اَن پڑھ تھی۔کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ وہ بہت بیمار رہنے لگی ہے۔

گاؤں سے کوئی اس کا پیغام لے کر آیا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی بہن اور اس کے بچے اس سے بہت تنگ ہیں اور اسے خود پر ایک بوجھ تصور کرتے ہیں۔امی کو جب اس صورتحال کا علم ہوا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ ایک معقول رقم ہر ماہ اسے منی آرڈر کر دی جائے۔اور امی نے اس کا ہمیشہ پاس رکھا۔کتنے ہی ماہ و سال گذر گئے۔اس دوران امی گاہے گاہے اس کا پتہ کرتی رہیں۔پھر ایک دن منی آرڈر واپس آ گیا۔تب پتہ چلا کہ ماسی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔پتہ نہیں کیوں یہ سن کر ایک انجانا سا دُکھ محسوس ہوا۔اور امی جان تو بہت زیادہ دُکھی ہو گئی تھیں۔وقت گذرتا چلا گیا اور ماسی شاہ نور ایک بھولا بسرا قصہ بن کر رہ گئی۔میری شادی ہو گئی اور میں اپنے سسرال چلی گئی۔میری بہن کی بھی شادی ہو چکی تھی لیکن ہم امی جان سے ملنے آتے تھے تو کتنی ہی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔اس بار جب میں چند روز امی کے پاس رہنے آئی تو باتوں ہی باتوں میں ماسی شاہ نور کا ذکر چھڑ گیا۔امی جان نے بتایا کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے پاس کراچی چلی گئی تھی۔اس کے شوہر کا بڑا بھائی اور بھابی بھی کراچی میں ہی تھے اور وہ ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔اس کا شوہر اپنی بھابی پر فدا تھا اس کا اندازہ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی اسے ہو گیا تھا۔پھر بھی اس نے اپنی سی کوشش کی کہ شاید اس کا شوہر اپنی اس حرکت سے باز آ جائے۔اسے یقین تھا کہ وہ اپنی محبت سے اس کا دل جیت لے گی اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن وہ اس عورت کے سحر سے نکل کر اس نئے رشتے کو دل سے قبول نہ کر سکا۔تلخیاں بڑھتی چلی گئیں اور شاہ نور دل برداشتہ ہوتی گئی۔جب وہ واپس اپنے میکے گئی تو پھر کبھی لوٹ کر اپنے شوہر کے پاس نہیں گئی۔اسی دوران اسے پتہ چلا کہ اس کے آنگن میں ایک ننھا سا پھول کھلنے والا ہے۔اس خبر نے اس کے اندر جیسے نئی رُوح پھونک دی تھی۔وہ اپنے سارے دُکھ بھول گئی۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کی محبت کے سہارے زندگی گذار لے گی لیکن قدرت کو یہ بھی منظور نہ ہوا اور چند ماہ میں ہی اس کی کوکھ اُجڑ گئی۔اس سانحے نے اس کی رہی سہی آس بھی ختم کر دی۔وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔

رَفتہ رفتہ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔اس نے اپنی تقدیر پر شاکر ہو گئی والدین کا انتقال تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور میکے میں اس کی ایک بہن کے سوا اس کا تھا ہی کون؟۔کچھ دن تک تو اس کی بہن نے اس کا خیال رکھا لیکن جب اسے پتہ چلا کہ وہ اب ساری عمر اس پر بوجھ ہے تو اس کی بہن نے بھی رَفتہ رفتہ اس سے آنکھیں پھیرنی شروع کر دیں اور اس کے بھانجے بھانجیاں بھی ماں کی دیکھا دیکھی اسی کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔اس پر گاؤں والوں کے طعنے الگ۔تب ماسی کو امی یاد آئیں اور وہ شہر چلی آئی۔امی نے اس کا ہمیشہ ساتھ دیا۔بلکہ اس کو دوبارہ شادی کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے لئے رشتے بھی ڈھونڈے لیکن ماسی ہر شخص میں نقص نکالتی۔کسی کی ناک اسے مینڈک جیسی لگتی تو کسی کا رنگ کوّے جیسا۔کسی کی توند پر ہنستی اور کسی کے بات کرنے کا انداز اُسے بھونڈا لگتا۔امی نے اسے ہر طرح سے سمجھایا کہ اب اس شخص کی یاد میں زندگی گذارنے کا کیا فائدہ جس نے عمر بھر پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔ایسے ہرجائی سے خلع لے کر اپنا گھر بسا لینا چاہیئے۔لیکن یہ کوئی بھی نہ جان سکا کہ آخر اس کا دل دوسری شادی پر کیوں کبھی آمادہ نہ ہو سکا؟۔کیوں اس نے ہر اس شخص کو رد کیا جس کا بھی امی نے اس کے لئے انتخاب کیا۔اب امی نے بھی اس کے لئے رشتے ڈھونڈنے بند کر دیئے تھے۔شاید انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ماسی کیا چاہتی تھی یہ کبھی کسی کو اندازہ نہ ہو سکا اور نہ ہی ماسی نے کبھی ظاہر ہونے دیا۔اس نے اپنے سارے زخم بلند و بانگ قہقہوں میں چھپا لئے تھے۔اب میری سمجھ میں آیا کہ ان بے ہنگم قہقہوں کا راز کیا تھا؟اس مجنونانہ ہنسی کی آڑ میں وہ کون سا درد چھپانے کی کوشش کیا کرتی تھی؟ آہ!ماسی شاہ نور۔

-

ایک شام عاصی صحرائی کے نام

(رپورٹ ابن لطیف)

آج مورخہ 15 دسمبر شام 185 مچم روڈ پر Tooting St Boniface Hall قندیل ادب شعروسخن کے فورم کے زیر انتظام ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جو" عاصی صحرائی کے نام ایک شام" کے نام سے تھا۔ ہمارے مشاعرے میں تشریف لانے والے شعراء کے نام مبارک صدیقی، امجد مرزا امجد، اقبال مجیدی، طفیل عامر، ڈاکٹر نجیب، لیوٹن سے شگفتہ شفیق، والنگٹن سے عابدہ شیخ، ڈاکٹر صوفیہ سطوت، محمد اسحاق عاجز جرمنی، قمر مرتضیٰ قریشی صاحبہ، ان کے علاوہ مقامی شعراء میں سے محمود علی محمود، ریاست رضوی، نورالجمیل نجمی، عبدالقدیر کوکب،

مشاعرہ ۱۵ دسمبر ۲۰۱۶ بمقام ۱۸۵ مچم روڈ سینٹ بونیفس چرچ ہال

واحداللہ جاوید، آصف علی پرویز، جلیل نکانوی، رمضان شائق نصیر پوری، جمال سوری، ملک بلال، آصف چغتائی، منظور ریحان، وحداللہ جاوید اور عاصی صحرائی تھے۔ تلاوت قرآن پاک سے کاروائی کا آغاز ہوا جو کہ قدیر کوکب نے کی۔ نظامت کا قلم دان کراچی کی مشہور شاعرہ شگفتہ شفیق صاحبہ کے سپرد تھا۔ جنہوں نے اسے بہت ہی خوبی سے نبھایا، صدر مجلس جناب مشہور شاعر مبارک صدیقی تھے۔ مہمانِ خصوصی عرفان خان دہلوی آف جرمنی تھے۔

امجد مرزا امجد نے رانا عبدالرزاق خان عاصی صحرائی کی دس سالہ ادبی کاوشوں کو بہت ہی اچھے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ ماہنامہ قندیل ادب نے جو اردو ادب کی آبیاری دیارِ غیر میں کی ہے۔ اسے بھی بہت سراہا۔ رانا عبدالرزاق خان عاصی صحرائی جو یوکے ٹائمز میں کالم لکھتے ہیں اور گوشہ ادب ترتیب دیتے ہیں اس کا بہت خوبی سے ذکر بھی کیا۔ اور مزید ان کے اچھے رویے اور نیک کردار پر بھی بھرپور روشنی ڈالی جسے کہ سامعین نے بہت ہی سراہا۔ ان کے بعد پروفیسر عبدالقدیر کوکب کا مقالہ تھا جو انہوں نے رانا عبدالرزاق خان عاصی صحرائی کے متعلق پڑھا۔ جیو ٹی وی والے چینل نمبر 854 یا سی 44 پر لائیو کاسٹ کررہے تھے۔ جو سب احباب نے سنا اور دیکھا۔

سب شعراء نے بہت ہی طرب خیز اور پُرلطف کلام سنایا۔ اس کی نظامت مشہور شاعرہ کراچی سے تشریف لائی تھیں محترمہ شگفتہ شفیق صاحبہ کررہی تھی۔ نوجوان شاعروں نے تو اک سماں باندھ دیا۔ اہل مشاعرہ جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ اسحاق عاجز نے اپنے سُر کا وہ کمال دکھایا کہ سب ہی مسحور ہو گئے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب شعراء نے رنگا رنگ کلام سنا کر مشاعرے کی رونق کو دوبالا کر دیا۔ آخر میں سب حاضرین کو بریانی پیش کی گئی۔ اور پھر انڈوں کا حلوے سے تواضع کی گئی یہ مشاعرہ بہت ہی یادگار مشاعرہ تھا، آخر میں رانا عبدالرزاق خان صدر قندیل شعروسخن فورم نے سب احباب کا تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ہمیں ایسی محافل کا انعقاد کرنے کی توفیق دیتا رہے۔ اور اُردو ادب کی آبیاری کی توفیق دیتا رہے۔ آمین۔

-

آفاتِ گوناگوں

آدم چغتائی

ہر جبیں پر نفرتوں کی اِک کھلی تحریر ہے
کیا یہی انسانیت کی دوستو! توقیر ہے
عدل بھی عنقا ہوا ہے اَمن بھی رُخصت ہوا
بے ہنر سب راہنما ہیں باہنر دلگیر ہے
نارسائی نے کیا ہے منجمدِ احساس کو
زندگی میں ہر قدم پر خوف دَامنگیر ہے
ملائیت نے کئے پامال اقدارِ حیات
شیطنت ہی دینِ مُلاں کی کھلی تصویر ہے
موند لی تاروں نے آنکھیں دیکھ کر خورشید کو
رات کو دن میں بدلنا مہر کی تاثیر ہے
کن پہ اَفشاں ہو رہی ہیں وحشتیں کردار کی
کون مخلص ہیں، لگی کن پر کڑی تعزیر ہے
زخم سینے کے نہ دیکھو کر نہ کریدو تم انہیں
کیونکہ ان میں جذبوں کی ، احساس کی تصویر ہے
بے کس و مظلوم پر رکھتا ہے وہ نظرِ کرم
دردمندوں کے لئے وہ صاحبِ اَکسیر ہے
ہم نے ہر ظالم کا آدمؔ ہاتھ روکا ہے یہاں
اپنی نظروں میں مقامِ اُسوہء شبیر ہے

نیا سال

پروفیسر ہادی مونس کنیڈا

چمن رنگ و بو کہکشاں دیکھتا ہوں
نئے سال کا میں سماں دیکھتا ہوں
شعراء کے تیرو کماں دیکھتا ہوں
سخن ور کا حسنِ بیاں دیکھتا ہوں
جہاں کفر و باطل کا تھا بول بالا
وہاں پنج وقتہ اذاں دیکھتا ہوں
جہاں خشک مٹی کبھی بے ثمر تھی
وہاں پر کِھلا گلستاں دیکھتا ہوں
فلک بوس نعرہ اللہ اکبر
نئے سال بھی یک زباں دیکھتا ہوں
ہماری فتوحات تو ہیں مقدر
جو دشمن پہ اَب میں گراں دیکھتا ہوں
ہماری رہائی فزوں سے فزوں تر
ہمیشہ سے میں بے گماں دیکھتا ہوں
نئے سال کی اِبتدا ہو مبارک
کہ سر پر نیا آسماں دیکھتا ہوں
محبت کا سر چشمہ زندگانی
بیابانیوں میں عیاں دیکھتا ہوں
قدم گاہِ غم میں کئی نیک رُوحیں
نئے سال میں شادماں دیکھتا ہوں
مطر جبیں نظر جن کی دیکھی
وہی گامزن کارواں دیکھتا ہوں
نیا سال مونسؔ مبارک ہو سب کو
کہ میں خوبصورت زماں دیکھتا ہوں

غزل

طارقؔ احمد مرزا۔(آسٹریلیا)

بیخودی یا شعور کی باتیں ، جذب و مستی، سرور کی باتیں
زیب دیتی نہیں اُسے پیارو ، جس کو اُس یار کی خبر ہی نہ ہو
دلنشیں، دلربا، افق تا افق ، مہر و لطف و جمال کا عالم
ان کی آنکھوں سے رہ گیا اوجھل ، جن کی اُس یار پہ نظر ہی نہ ہو
خوف ہوتے ہی امن بھر دینا، پھر عِنایاتِ خاص بھی کرنا
یہ محبت انہیں نصیب کہاں ، جن پہ اُس یار کی نظر ہی نہ ہو
بیچ گرداب ڈوبتے لوگو ایک لمحے کو سوچ تو لیتے
ہاتھ ٹھکرا رہے ہو تم جس کا ، اِس زمانے کا وہ خضرؔ ہی نہ ہو

کیوں اندھیرا ہے یہ چراغ تلے ، حاکمِ وقت تم ہی بتلاو
درد سارے جہاں کا ہو دل میں، اور گھر کی کوئی خبر ہی نہ ہو
آتشِ ظلم و جور ، دار و رسَن ، نہ ہلا پائیں گے ہمارے قدم
تم نے یہ کس طرح سے سوچ لیا، کوئی منصورؔ ہو، نڈر ہی نہ ہو
تم لگالو نسیم پر پہرے، ہاں مگر کس طرح یہ ممکن ہے
بعد مدت کے اِک گلاب کھلے ، تتلیوں کو مگر خبر ہی نہ ہو
یاس وحسرت ،شکست و رسوائی، جو لکھی ہے تمہاری قسمت میں
دیکھنا اے مرے غنیم کہیں یہ مری آہ کا اثر ہی نہ ہو
ماورائ حیاتِ کون و مکاں روح کا یہ سفر تو جاری ہے
جسمِ خاکی نہیں ہے گھر ایسا ، زندگی جس بِنا بسر ہی نہ ہو
اتنا بے دست و پا نہیں طارقؔ ، کوچۂ یار تک بھی پہنچوں گا
یہ تو ممکن نہیں کہ جیتے جی اُس طرف سے مرا گزر ہی نہ ہو

غزل

عبدالقدیر کوکب

جب ملیں اُن کی نگاہوں سے نگاہیں میری
یوں لگا دور ہوئیں جیسے بلائیں میری
بات کرنے سے جھڑیں پھول لبوں سے اُن کے
اُن کی مسکان سے اُڑتی ہیں خزائیں میری
اُن کی نظروں نے زمانے کو کیا یوں روشن
ہیں اُسی نور سے معمور نگاہیں میری
میرے جیون کی ہے اُمید فقط اُن سے ہی
جن سے وابستہ ہیں ساری ہی ادائیں میری
اُن کی نظروں میں محبت کا سمندر پاکر
ڈوبنے کو ہوئیں بے تاب نگاہیں میری
اِک جھلک دیکھے نہ کوکبؔ تو سکوں ملتا نہیں
کاش لگ جائیں انہیں ساری ہی دعائیں میری

مجھ سے مت پوچھ میرے محبوب کی سادگی کا انداز
نظریں بھی مجھ پے تھی اور پردہ بھی مجھ سے تھا

دعا

عطاء المجیب راشد

کیوں نہیں لوگو تمہیں خوفِ خدا
کیوں بھلا بیٹھے ہو تم روزِ جزا
جو لگایا میرے مولا نے شجر
کاٹ ڈالو گے اُسے کیسے بھلا؟
شاہد و مشہود کے انکار پر
رُوبرو مولا کے تم بولو گے کیا؟
ظلم کرتے ہو عبث تم رات دن
کیوں بنے پھرتے ہو تم خود ہی خدا
سوچ لو کہ ظلم کی پاداش سے
کوئی بچتا تم نے دیکھا ہے بھلا
خوں شہیدانِ وفا کا ظالمو!
رنگ لائے گا یقیناً جا بجا
یاد رکھنا جب پکڑتا ہے خدا
نقش دَھرتی سے وہ دیتا ہے مٹا
آج ہراِک ملک میں ہر احمدی
کر رہا ہے اپنے مولا سے دعا
"کچھ نمونہ اپنی قدرت کا دکھا"

چوہدری عبدالمجید ظفر لندن میں رحلت فرما گئے

قندیل ادب انٹرنیشنل کو بڑے افسوس سے مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے شاعر دوست چوہدری عبدالمجید ظفر لندن میں قضائے الہٰی سے ۷۶ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔مرحوم بہت اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے۔کہنہ مشق شاعر اور ادیب تھے۔صاحب دیوان بھی تھے۔رحیم یار خاں پاکستان لیور برادرز میں کافی عرصہ ملازمت کی۔پھر جرمنی آ گئے۔دس سال سے لندن میں مقیم تھے۔قندیل شعروسخن فورم کے مشاعروں کی رونق تھے۔آپ ہمارے نوجوان شعراء عامر امیر اور طارق مجید کے والد تھے۔اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ مقام سے نوازے اور غریق رحمت کرے۔آمین۔